ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

ستمبر ۲۰۱۸ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۳ | ذی الحجہ-محرم ۱۴۴۰-۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اللہ کا قانون بے لاگ ہے	مولانا محمد منظور نعمانیؒ	
۲۔	اداریہ	فکری زاویے:	مدیر	۳
		''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''		۶
		ترکی کا معاشی بحران		
۴۔	پیام سیرت	چلے بھی آؤ کہ ہم انتظار کرتے ہیں	محمد فرید حبیب ندوی	۱۱
۵۔	فکر ونظر	عالم اسلام میں شورش کی فکری بنیادیں	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۳
۶۔	احوال ترکی	ترکی کے تازہ حالات.....	مولانا یحییٰ نعمانی	۱۷
۷۔	ماحولیات	ماحول کو پاکیزہ اور اسلامی بنائیے	محمد قمر الزماں ندوی	۲۶
۸۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۱
۹۔	انکار حدیث	حضرت ابو ہریرہؓ پر استاد احمد امین کے اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۳۶
۱۰۔	عورت اور اسلام	عورت، ہمارا رویہ اور اسلام کی تعلیم	علامہ یوسف القرضاوی، ترجمہ: محمد شعیب ندوی	۴۵
۱۱۔	نقد ونظر	دہلی سلطنت کی تمدنی تاریخ پر.....	ذیشان سارہ	۵۶
۱۲۔	تعارف و تبصرہ	''رجب طیب اردوغان''	ڈاکٹر انور حسین خاں	۶۳
۱۳۔	شعر و ادب	غزل	شعیب احسن اعظمی	۶۱

❁ ❁ ❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

فکری زاویے

نـــوٹ: ذہن میں ایک عنوان ''عیدالاضحیٰ کا سبق'' تھا، کچھ خاص نکات تھے جن کو اس عنوان کے تحت پیش کرنے کا خیال تھا، مگر مختلف مصروفیات نے لکھنے کا موقع نہ دیا، عین وقت درج ذیل یہ دونوں موضوعات زیادہ ضروری معلوم ہوئے کہ ان کو قارئین تک پہنچایا جائے، چنانچہ اس مضمون کو چھوڑنا پڑا لیکن انشاءاللہ دیر سے صحیح مگر آئندہ ماہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ مدیر

جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے :

بچپن سے ہی یہ کہاوت سنتے آئے تھے، جب کوئی بے پر کی اڑاتا تھا تو بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے جو چاہو کہو **''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''**۔

لیکن اس کہاوت کا جس قدر انطباق جمہوری طرز حکمرانی پر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور پر ہوتا ہو، میڈیا جمہوریت کے چار بنیادی ستونوں میں سے ایک اہم ستون ہے، لیکن اس نے گویا اس کہاوت کو ہی اپنا نصب العین بنالیا ہے، بے پَر کی اڑانا، رائی کو پہاڑ بنانا، مجرم کو پاکباز ثابت کرنا، نکمے اور بے کار شخص کو مسیحا بنا کر پیش کرنا میڈیا کا ہتھکنڈہ بن چکا ہے، عریانیت کو عام کرنا، جنسی ہیجان برپا کرنا، کھوٹے اور سڑے مال کی اشتہار بازی کرنا اس کا پسندیدہ عمل ہے، میڈیا نے جمہوریت کی بنیادیں کھوکھلی کردی ہیں، پیسہ کمانے کی ہوڑ میں وہ اندھا ہو چکا ہے، میڈیا جھوٹ کو جذبات کے استحصال کا ذریعہ بنا کر پیش کرتا ہے اور اس طرح وہ ایک ایسی حکومت یا حکمراں کو کسی ملک پر مسلط کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے جو ملک کی جڑیں کھوکھلی کردے، ملک کو غریبی کے دلدل میں پھنسادے، اس کی رفتار ترقی پر بریک لگادے، ملک میں فساد و کرپشن عام ہوجائے، جگہ جگہ انسانی خون کی ہولی کھیلی جائے، سچے اور شریف انسانوں کو سڑکوں پر دوڑا دوڑا کر پیٹا جائے، (سوامی اگنی ویش کو رانچی اور پھر دلی میں پیٹنے کا واقعہ کوئی پرانا نہیں)، کرنسی گرتی جائے اور مہنگائی و بے روزگاری بڑھتی جائے مگر میڈیا ہے کہ **''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''** والی کہاوت کا دامن چھوڑنے کو تیار نہیں، اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ؎

دوزخ کے انتظام میں الجھا ہے رات دن
دعویٰ یہ کر رہا ہے کہ جنت میں جائے گا

یوں تو جمہوری طرز حکمرانی اور بالخصوص موسم انتخابات میں اس کہاوت کی اہمیت دوبالا ہوجاتی ہے، مگر واقعی اگر اس کہاوت کو مجسم دیکھنا ہو یا کسی پر صد فیصد اس کہاوت کو منطبق ہوتا دیکھنا ہو تو وطن عزیز کے ''سب سے بڑے خادم'' کی شخصیت کا مطالعہ کرنا چاہیے، اگر آپ نے ذرا بھی غور سے

مطالعہ کیا تو بے ساختہ کہہ اٹھیں گے ۔

کچھ اور کام تو جیسے اُسے آتا ہی نہیں
مگر وہ جھوٹ بہت شاندار بولتا ہے

واقعہ یہ ہے کہ اس وقت سیاست جھوٹ اور اداکاری سے ہی چل رہی ہے، ان ہی اوصاف کے ماہرین کی سیاست میں پذیرائی بھی ہے، بقول شاعر ۔

واقف ہے خوب جھوٹ کے فن سے یہ آدمی
یہ آدمی ضرور سیاست میں جائے گا

ابھی ۱۵ اگست کو ایک گھنٹہ بائیس منٹ کی تقریر لال قلعہ کی فصیل سے فرمائی گئی، اس تقریر کا سب سے بڑا جھوٹ یہ تھا کہ محترم فرمارہے تھے ''میں ملک کو بیچنے نہیں دوں گا'' حالانکہ جس فصیل پر کھڑے وہ یہ دعوی کررہے تھے، آزادی کی علامت وہ فصیل بھی ان سے سنبھالی نہ گئی اور اس کو بھی کرایہ پر ایک پرائیوٹ کمپنی کے حوالے کردیا، اس تاریخی خطاب میں بے شمار جھوٹ بولے گئے کیوں کہ ''جھوٹ کے پاؤں ہی نہیں ہوتے'' مگر اب دنیا اتنی بے وقوف نہیں رہی، اب تو فوراہی تحقیقات شروع ہوجاتی ہیں اور منٹوں سکنڈوں میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجاتا ہے، اب زمانہ بدل چکا ہے، بے پاؤں کے جھوٹ کے آثار ونقوش بھی ذراسی دیر میں تلاش لیے جاتے ہیں۔

ذرا دیکھیے حضور انتہائی اعتماد کے ساتھ پورے ملک کو سمجھا گئے کہ ''ابھی ڈبلیو ایچ او World health organization کی رپورٹ آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ''صفائی مہم، سوچھ بھارت ابھیان'' کی وجہ سے بھارت میں تین لاکھ بچوں کی جان بچ گئی، اگر یہ نہ ہوتا تو یہ تین لاکھ بچے نہ بچ پاتے''، ہمیں تو اپنے آس پاس کہیں اس صفائی مہم کے اثرات نظر نہ آئے بلکہ گزشتہ سال گجرات ماڈل کے مرکزی شہر احمد آباد کا سفر ہوا تو وہاں بھی اس کے اثرات دیکھنے کو نہ ملے بلکہ شہر کے وسط میں کوڑے کا پہاڑ دیکھنے کو ملا، بہر حال اس دعوے کی حقیقت یہ ہے کہ WHO نے اپنی ایک رپورٹ میں سوچھ بھارت ابھیان پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ ''اگر اس پروگرام یا اس مہم کو سو فیصد نافذ کردیا جائے تو اکتوبر ۲۰۱۹ء تک تین لاکھ بچوں کی جان بچائی جاسکتی ہے''، مگر بھلا ہو جھوٹ کا کہ ۱۵ اگست ۱۸ء میں ہی تین لاکھ بچوں کی جان بچانے کا اعلان کردیا گیا اور ملک کے عوام کو یہ کہہ کر خوش کیا گیا کہ ''بھارت کا کون سا ایسا انسان ہوگا جس کو اس مہم میں شامل ہوکر تین لاکھ بچوں کی جان بچانے کے کارِ ثواب میں شرکت کا موقع نہ ملا ہو''۔

آگے صاحب نے فرمایا کہ ''بھارت کے پاسپورٹ کی عزت بڑھ گئی ہے، دنیا کا کوئی بھی دیش کسی بھی بھارتی کا استقبال کرنے کو تیار رہتا ہے''، پاسپورٹ کی عزت بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے پاسپورٹ کو کتنے ملکوں میں آسانی سے On Arrival Visa حاصل ہوجاتا ہے، اگر اس دعوے کی حقیقت جاننا ہو تو آپ Global Passport Power

Index لکھ کر علامہ گوگل کے مفت انسائیکلومیڈیا میں جواب تلاش کیجئے، تو پتہ چلے گا کہ ہمارے پاسپورٹ کو ۶۵ ویں پائیدان (65th rank) پر رکھا گیا ہے، جبکہ ایک ایک رینک پر کئی کئی ممالک بھی ہیں اس طرح ہمارے پاسپورٹ سے پہلے تو تقریبا 150 ممالک کے پاسپورٹ ہیں، مگر ظاہر ہے کہ اس جھوٹ کی حقیقت کو کتنے لوگ جاننے کی کوشش کریں گے، عوام تو خوش ہوکر اسے وطن کی عزت میں اضافہ اور حکومت کی کامیابی ہی شمار کریں گے۔

اس خطاب میں صاحب نے فرمایا کہ ''اس وقت ملک سے شہد کا ایکسپورٹ دوگنا ہوگیا ہے''، اگر اس کی حقیقت آپ انٹرنیٹ پر تلاش کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شہد کے ایکسپورٹ میں ہمارا ملک گیارہویں نمبر پر ہے بلکہ پچھلے سال کے مقابلہ اس سال شہد کے ایکسپورٹ میں اچھی خاصی کمی آئی ہے، مگر انتہائی چالاکی سے جھوٹ کا سہارا لے کر اس گراوٹ کو اضافہ میں تبدیل کر کے دکھادیا گیا، جس کا دل چاہے وہ اس کی تفصیل گوگل سے معلوم کرلے۔

ایک اور اہم جھوٹ انھوں نے ہندوستان کے گاؤں میں بجلی پہنچانے سے متعلق بولا، ان کا بیان تھا ''کہ اگر ۲۰۱۳ء کی بنیاد پر ہم بجلی گاؤں میں پہنچانے کا عمل کرتے تو کم از کم دو دہائی اور لگ جاتیں'' جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مختلف رپورٹوں کے مطابق کانگریس کے دس سالہ دور اقتدار میں ہر سال کے اعتبار سے تقریبا ۱۲۰۳۳ گاؤں میں بجلی پہنچی جبکہ بھاجپا کے چار سالہ دور حکومت میں ہر سال کے اعتبار سے ۴۵۹۴ گاؤں میں بجلی پہنچائی گئی، لیکن لال قعلہ کی فصیل سے پورے ملک کو میڈیا نے یہ بے بنیاد دعویٰ حکومت کی اہم کامیابی کے طور پر دکھادیا اور ایک تبصرہ تک نہ کیا، بھلا ہو ان متحرک وفعال لوگوں کا جو دجالی میڈیا کے بالمقابل سوشل میڈیا کو ذریعہ بنا کر بے پیر کے جھوٹ کے بھی نقوش قدم تلاشنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ایک اور اہم جھوٹ دیکھیے، فرماتے ہیں ''کہ ۱۳ کروڑ مُدرالون بہت بڑی بات ہوتی ہے، پہلی بار ملک میں اتنی بڑی تعداد میں مُدرالون دیا گیا، اس میں بھی ۴ کروڑ نوجوان ہیں جو مُدرالون کے ذریعہ پہلی بار باروزگار ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑے ہوئے ہیں''، اب ذرا اس کی حقیقت سنیے اور سر پیٹیے، اس روزگار کی حقیقت یہ ہے کہ ۹۰ فیصد لوگ ایسے ہیں جن کو مُدرالون کے نام پر ۵۰ ہزار روپیے سے کم کا لون دیا گیا ہے، یہ بات خود حکومت نے انڈیا ٹوڈے کی ایک RTI کے جواب میں کہی ہے، اب ذرا سوچیے کیا پچاس ہزار روپیے میں وزیراعظم کی تجویز کے مطابق پکوڑے بنانے اور بیچنے کا ٹھیلہ بھی تیار ہوسکتا ہے، یہ ہے اس لون اور روزگار کی حقیقت جس کو سن کے ملک کے عوام کا سینہ چوڑا ہوگیا ہوگا۔

ضرورت ہے کہ جذباتی نعروں اور باتوں سے بالا ہوکر ہم تکنیکی (Data Based) بحث کا ماحول بنائیں، اور کچھ ایسے لوگوں کو اس کام کے لیے لگائیں جو اس طرح کی تحقیقات سے عوام کو آگاہ کریں جیسا کہ کچھ لوگ اپنے طور پر انجام دے رہے ہیں، ضرورت ہے کہ دجالی میڈیا کا پردہ چاک کیا جائے اور قدم قدم پر اس کی پول کھولی جائے، ورنہ یاد رکھیے **''جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے''** اور دنیا کا موجودہ دجالی نظام اسی جھوٹ پر قائم ہے، اسی جھوٹ کی پرورش کرتا ہے اور اسی جھوٹ کے سہارے اس کا پورا کاروبار چلتا ہے، اس جھوٹ کا سہارا لینے میں سبھی شریک ہیں البتہ حصہ کم زیادہ ہوسکتا ہے، اگر ان پہلوؤں پر توجہ نہ دی گئی

تو پھر بات بہت دور نکل جائے گی، ضرورت ہے کہ ضمنی مسائل جن میں حکومت الجھانا چاہتی ہے ان سے بچتے ہوئے سوالات کی ہر چہار جانب سے بوچھار کی جائے اور حقائق کو کھول کھول کر ہر زبان میں عوام کے سامنے بیان کیا جائے، وطن عزیز اب غلط رخ پر چل پڑا ہے، آئین ہند میں تبدیلی کی تیاری ہے، قانون میں نت نئی تبدیلیاں کی جارہی ہیں، مسلم پرسنل لا میں مداخلت ہی نہیں بلکہ اس کو حکومت اور پارلیمنٹ سے طے کیے جانے کا عندیہ دیا جاچکا ہے، لاکھوں لوگوں کی شہریت پر سوالیہ نشان لگایا جارہا ہے، بڑی تعداد میں ووٹرلسٹ سے شہریوں کے نام غائب کردیے گئے ہیں، کم از کم دو سے تین کروڑ مسلمان ووٹروں کے نام ووٹرلسٹ سے غائب ہیں، ضررت ہے کہ ان سب پہلوؤں پر توجہ دینے اور ایک مہم چھیڑنے کی، وطن کو بچانے اور وطن کی معیشت کی حفاظت کرنے کے لیے یہ کام انتہائی ضروری ہوگیا ہے، اگر اب بھی ہوش نہ آیا تو نہ ملک کی سالمیت محفوظ رہے گی اور نہ تہذیبی یکجہتی اور نہ سیکولر دستور ہند اور اقلیتی حقوق، اب ضروری ہے کہ ذاتی اور جماعتی مفاد سے بالا ہوکر تکنیکی جنگ کا آغاز کیا جائے اور لوگوں کو حکومت کی دھاندلیوں اور قانونی دہشت گردی سے بڑے پیمانے پر واقف کرایا جائے۔

ترکی کا معاشی بحران:

رجب طیب اردوغان صدارتی انتخاب جیت کر ترکی کے سب سے طاقتور شخص بن گئے، مگر ابھی چین کا سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ اچانک دجالی نظام کے ٹھیکیدار امریکہ نے ترکی کرنسی لیرہ پر کریک ڈاؤن شروع کردیا، گزشتہ ہفتہ لیرہ بمقابلہ ڈالر ۲۰ فیصد نیچے آگیا، یہ بات ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ اگر اردوغان کو کامیابی ملی ہے تو اب ان کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی ہیں، آزمائشیں بھی زیادہ ہوں گی، مقابلہ ہمہ جہتی اور سخت ہوگا، وسائل اور معاونین کم ہوں گے، واقعہ یہ ہے کہ ترکی کی گھیرابندی شروع ہوچکی ہے، امریکہ نے ترکی کے خلاف معاشی جنگ چھیڑ دی ہے مگر دیکھنا یہ ہے کہ کیا ترکی مردِ دانا کی قیادت میں ایک بار پھر اس بحران سے نکلنے میں کامیاب ہوسکے گا؟ تجزیات کہتے ہیں کہ جلد ہی امریکہ کو اس جنگ میں انشاءاللہ منہ کی کھانی پڑے گی، خود امریکی نیوز چینل CNN کے ایک تجزیہ کار نے امریکہ کو خبردار کیا ہے کہ وہ ترکی سے اپنے معاملات درست کرے ورنہ اسے بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا!

درحقیقت ۲۰۲۳ء سے قبل امریکہ و یورپ ترکی کو پھر سے سو سال قبل کی حالت زار میں پہنچا دینے کے خواہاں ہیں، مگر شاید اس مرتبہ مردِ آہن کا یہ آہنی عزم کہ ''اگر تمہارے پاس ڈالر کی طاقت ہے تو ہمارے پاس اللہ کی طاقت اور عوام کا تعاون ہے''، یورپ و امریکہ کی خواہشیں پوری نہ ہونے دے، امریکہ کی بھرپور کوشش تھی کہ وہ ترکی کو عراق و شام میں گھسیٹ کر ایک ایسے دلدل میں پھنسا دے جس سے نہ صرف یہ کہ اس کا نکلنا دشوار ہوجائے بلکہ وہ خانہ جنگی کا شکار ہوجائے اور اس کی معیشت تباہ ہوجائے، مگر اردوغان نے کمالِ دانشمندی سے امریکی منصوبہ کو ناکام بنایا اور شام میں امریکہ ترکی کے کامیاب آپریشن کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہ گیا، اردوغان نے بڑی حد تک شام-ترکی سرحدی علاقہ کو باغیوں اور دہشت گردوں سے پاک کیا، اب اس علاقہ میں تعمیر و ترقی کا بار بھی ترکی اٹھائے ہوئے ہے، خود ترکی میں چالیس لاکھ شامی مہاجرین کا بار اس کے کاندھوں پر ہے، بعض تباہ شدہ ممالک کی تعمیر نو

میں اس کا کردار نمایاں ہے، ان سب وجوہات کے سبب اس کی معیشت پر اضافی بوجھ تو پہلے سے ہی تھا، مگر ادھر اچانک عالمی قانونِ تجارت کی یکسر خلاف ورزی کرتے ہوئے امریکہ نے ترکی سے المونیم اور اسٹیل کے امپورٹ پر ۴۰ سے ۶۰ فیصد تک ٹیکس بڑھا دیا، جس سے فوری طور پر ترک کرنسی پر بھاری اثر پڑا، لیکن اس کو اس طور پر نہیں پیش کرنا چاہیے کہ گویا ترکی معیشت بالکل تباہ ہوگئی ہو، سابق وزیر اعظم اور موجودہ اسپیکر بن علی یلدریم کے مطابق یہ معاشی بحران نہیں سیاسی بحران ہے اور جلد ہی اس پر قابو پالیا جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکی و امریکہ کے درمیان جولائی ۲۰۱۶ء سے ہی تعلقات کشیدہ ہونے لگے تھے جبکہ ترکی میں ناکام فوجی بغاوت میں امریکہ کے ملوث ہونے کے مبینہ ثبوت سامنے آگئے تھے، ترکی نے امریکہ میں مقیم ترک نژاد عالم فتح اللہ گولن کے خلاف دستاویزی ثبوت دے کر حوالگی کا مطالبہ کیا مگر امریکہ نے اسے مسترد کر دیا، معلوم نہیں گولن پر امریکہ کیوں اس قدر مہربان ہے، حالیہ بحران کی ابتدا یوں ہوئی کہ ترکی نے ۲۰۱۶ء کی ناکام فوجی بغاوت میں ملزم امریکی پادری اینڈریو برنسن کو رہا کرنے کے امریکی مطالبہ کو سختی سے مسترد کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ جب امریکہ نے ایران پر نئی اقتصادی پابندیاں عائد کیں تو ترکی نے انھیں تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ ایران سے تعلقات استوار رکھنا فی الوقت ترکی کی مجبوری ہے، منجملہ دیگر اسباب کے (تفصیل کا موقع نہیں) ترکی تیل ایران سے ہی خریدتا ہے، ادھر امریکہ شام میں اپنی ناکامی پر پہلے ہی کھسیانی بلی کی تصویر بنا ہوا تھا، باوجود اس کے کہ اس نے شام میں باغی کُرد فورسز کو مسلح کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی، ترکی فوج نے عفرین پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد اس کے ثبوت میں ویڈیوز بھی جاری کیے۔ چنانچہ اس نے ترکی کی کمر توڑنے کے لیے یہ نیا حربہ اپنایا، مگر جناب اردوغان ثابت قدم رہے، وہ ڈرے نہیں، جھکے نہیں، نہ ہی رحم کی بھیک مانگی بلکہ انھوں نے دوٹوک انداز میں کہا کہ ''ہم جھکنے والے نہیں، ہم ۲۰۲۳ء تک کے اپنے تمام منصوبے مکمل کریں گے، ہم نئے دوست اور نئے امکانات تلاش کر کے بھرپور جواب دیں گے، ان مسائل کو بات چیت کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ ہم کو دھمکایا نہ جائے''۔

انھوں نے ترک قوم اور ترکی کے بہی خواہوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اس برے وقت میں ترکی کی مدد کے لئے آگے آئیں، وہ ڈالر کو فروخت کر کے لیرہ خریدیں یا ڈالر کے بدلہ گولڈ خرید کر رکھیں، امریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں، امریکی الیکٹرانکس کا تو انھوں نے سرکاری طور پر بائیکاٹ کا اعلان کر دیا، امریکی شراب اور تمباکو کے پروڈکٹس پر انھوں نے ۱۶۰ فیصد تک کا اضافی ٹیکس عائد کر دیا، خاص طور پر اس آخر الذکر اس اعلان سے گویا انھوں نے ایک تیر سے دو شکار کیے، انھوں نے آئی فون کو چھوڑ کر سیم سنگ یا ٹرکش انڈرائڈ کو استعمال کرنے کی اپیل کی اسی طرح امریکی مصنوعات کے بالمقابل ترکی مصنوعات کے استعمال کی درخواست کی، بہت خوش آئند بات یہ ہے کہ اس موقع پر پوری ترک قوم اختلاف فکر و نظر کو بالائے طاق رکھ کر متحد نظر آئی اور اردوغان کی آواز پر لبیک کہا، متعدد ایسے ویڈیوز وائرل ہوئے جن میں ڈالر کو جلاتے ہوئے اور پیروں سے روندتے ہوئے دیکھا گیا، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ڈالر سے ناک صاف کرتے ہوئے دیکھا گیا، ڈالر کو لیرہ میں تبدیل کرتے ہوئے دیکھا گیا، سونا خریدتے ہوئے دیکھا گیا، ترکی سے باہر مقیم بہت سے کروڑ پتی ترکوں اور عربوں نے ڈالر فروخت کر کے لیرا خریدا یا دوسری کرنسی خریدی، ترکی میں

نوجوانوں کو اپنے آئی فون ہتوڑے سے توڑتے ہوئے دیکھا گیا، **غرض کہ اس موقع پر پھر وہی سماں نظر آیا جو خلافت کے تحفظ کے لیے بیسویں صدی کے آغاز میں دنیا بھر میں نظر آیا تھا، جو جہاں موجود ہے وہیں اس نے جذباتی طور پر ترکی سے یگانگت و یکجہتی کا اظہار کیا**، ایسی اپیلیں جاری کی گئیں کہ کم از کم سو لیرہ ہی خرید کر اپنے پاس رکھ لیے جائیں، قطر نے آگے بڑھ کر مواخات کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۵ بلین ڈالر کی اضافی سرمایہ کاری کا عندیہ دیا، ترکی کے دکاندار اپنی دکانوں سے امریکی مصنوعات کو باہر نکال کر پھینکتے نظر آئے، استنبول کے ایک ہوٹل کے مالک نے اعلان کیا کہ جو شخص بھی ڈالر کو لیرہ میں تبدیل کر کے آئے اس کی طرف سے مفت مچھلی فرائی سے اس کی تواضع کی جائے گی، متعدد انٹرویوز میں ترکوں کو کہتے ہوئے سنا گیا کہ ہم ایک وقت کھانا کھائیں گے وہ بھی نہ ملے تو گھاس کھالیں گے مگر اپنی ملکی کرنسی کو گرنے نہیں دیں گے، ہمیں امریکی تسلط قطعاً برداشت نہیں ہے، **ان خوش کن خبروں کے ساتھ یہ امر خون کے آنسو رلانے کے لیے کافی ہے کہ جو لوگ سو سال قبل خلافت کی قبا چاک کرنے میں شریک تھے وہ آج بھی ترک کی تباہی پر بغلیں بجا رہے ہیں، ترکی کمر توڑنے اور اردوغان کو ناکام ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششوں میں مصروف ہیں، اللہ عرب کے ان سیاسی چغد سر براہوں اور مذہبی مجاوروں کو عقل سلیم دے۔**

یاد رکھنا چاہیے کہ جب عوام میں اپنے حکمراں کے تئیں ایسا جذبۂ وارفتگی اور جنونِ حریت اور ایسی سوجھ بوجھ ہو تو پھر ایسے ملک اور ایسے حکمراں کو شکست دینا آسان نہیں، ترک قوم حقیقت پسند واقع ہوئی ہے، اس کو کبھی کوئی غلام نہیں بنا سکا، اردوغان سے ترکوں کی محبت تجرباتی اور تجزیاتی ہے، اردوغان کو ہمیشہ مینڈٹ کارکردگی، حصولیابی، اور خوب سے خوب تر کی امید میں ملتا ہے، ترک اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ ہمیں غلام بنانے کی ابتدا ہے، کیوں کہ موجودہ نظامِ عالم میں ممالک کو تجارتی منڈی بنا کر ہی غلام بنایا جاتا ہے، تجارتی منڈی اور اپنی کالونی بنانے کے لیے ہی جنگیں تھوپی جاتی ہیں، چند ایک ممالک ہیں جنہوں نے پوری دنیا کو بالخصوص مسلم ممالک کو صارفین کی دنیا بنا کر رکھ دیا ہے، امریکہ کو کب یہ برداشت ہوسکتا تھا کہ ترک مصنوعات کی ۱۵۰ سے زائد ممالک میں سپلائی ہو، صحیح اور ذاتی اطلاعات کے مطابق متعدد ممالک میں متعدد ترک مصنوعات مارکیٹ پر اپنا قبضہ جما چکی تھیں، اس لیے امریکہ کی طرف سے آج نہیں تو کل یہ تو ہونا ہی تھا، لیکن یہ بھی سچ ہے کہ شاید امریکہ کا یہ اقدام اس کے زوال کا ہی پیش خیمہ بن جائے، خود اس کے تھنک ٹینک نے بھی اس کو اس سلسلہ میں متنبہ کیا ہے، اردوغان کی اپیل کا یہ اثر ہوا ہے کہ صرف ایک ہفتہ میں لیرہ کی حیثیت میں ۶ فیصد بہتری آئی ہے اور آئندہ کچھ دنوں میں اس خسارے پر مکمل قابو پا لینے کی قوی امید اور روشن امکانات ہیں، اردوغان نے ڈالر کا متبادل تلاش کرنے پر بھی دوست ممالک کو غور کرنے کا مشورہ دے دیا ہے، اور بہت ممکن ہے کہ اردوغان کا یہ مشورہ امریکہ کے زوال میں کلیدی رول ادا کر جائے، جبکہ ماہرین جانتے ہیں کہ امریکہ بوڑھا ہو چکا ہے، اور اس کے عروج کی مدت پوری ہو چکی ہے، اس کی تہذیب اب اپنے ہی خنجر سے اپنے آپ کو قتل کر رہی ہے، اس کی معیشت پورے طور پر تباہ ہو چکی ہے، وہ اب خلیجی ممالک سے خراج وصول کر کے زندہ ہے جس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں، تجزیہ کاروں کا یہاں تک کہنا

ہے کہ اگر ترکی روس وچین اور ہندوستان سے اپنے تجارتی تعلقات مزید مستحکم کرنے میں کامیاب ہوگیا اور یوریشیائی ممالک کا اعتماد حاصل کرلیا تو وہ ناٹو کو بھی خیر باد کہہ سکتا ہے اور یورپین کسٹم یونین کی رکنیت سے بھی دستبردار ہوسکتا ہے۔

مخلص ماہرین تو پہلے ہی اردوغان کو متبادل تلاش کرنے کا مشورہ دیتے رہے ہیں، اردوغان نے بھی کبھی صرف امریکہ پر ہی مکمل اعتماد کرنے کی غلطی نہیں کی، چنانچہ باوجود ناٹو اور یورپی کسٹم یونین کا رکن ہونے کے ترکی کا سب سے بڑا تجارتی شریک Buisness partner روس رہا ہے، اب روس سے مزید تعلقات مستحکم کرنے کی تگ ودو جاری ہے اور روس کو بھی اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لئے کسی مضبوط پارٹنر کی ضرورت ہے۔

بہرحال اس موقع پر ہم صرف اور صرف ترکی کے لیے دعا ہی پر اکتفا نہیں کرسکتے، بلکہ آگے بڑھ کر اس کا کچھ عملی تعاون بھی کرسکتے ہیں، اس کی مصنوعات جو یہاں ملتی ہوں انھیں خرید سکتے ہیں، ورنہ خلیجی ممالک میں مقیم اپنے اعزہ سے لانے کی درخواست کرسکتے ہیں، ان کے ذریعہ لیرہ خرید کر رکھ سکتے ہیں اور اس طرح کا جو بھی طریقہ اپنایا جاسکتا ہو اسے اپنا سکتے ہیں، بین الاقوامی اسفار میں ٹرکش ایئر لائن کا انتخاب کرکے ترکی کی مدد کرسکتے ہیں جو پہلے ہی سے ٹاپ ایئر لائنز میں شمار ہوتی ہے، سیر وسیاحت کے لئے یورپی ممالک کے بجائے ترکی کے خوبصورت ودلکش اور تاریخی شہروں کی سیاحت کا انتخاب کرسکتے ہیں، یاد رکھیے اگر ہماری گاڑھی اور موٹی کمائی کا تھوڑا سا حصہ بھی ترک کرنسی کی حیثیت کو بچانے میں لگا تو مستقبل کی تاریخ میں ہمارا نام ویسے ہی نمایاں ہوگا جیسے خلافت کو تحفظ فراہم کرنے کی تگ ودو کرنے والوں کا نام زندہ ہے، اگر ترکی اس بحران سے نکل آتا ہے ___ اور انشاءاللہ ضرور نکلے گا ___ تو امریکی غرور پاش پاش ہوگا، دجالی سانپ کا زہر مرجائے گا اور اس کا رِثواب میں ہمارا حصہ بھی اللہ کے یہاں محفوظ ہوجائے گا، موجودہ نظام میں اصل جنگ اور برتری اقتصاد کے ذریعہ ہی قائم ہوتی ہے، ملت اسلامیہ کے پاس یہ ایک سنہرا موقع ہے ترکی کو تقویت پہنچانے اور دجالیت کی کمر توڑنے کا، کیا ہمارے اصحاب ثروت اور سرمایہ کار آگے آئیں گے، کیا ہمارے علماء اور دانشوران ان کی رہنمائی کریں گے، کیا ہم اس مسئلہ کی اہمیت سے واقف ہوگئے، کیا ہمیں ہوش آیا یا اب بھی نہیں؟ جواب مستقبل دے گا، فی الحال تو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ اردوغان کا حامی وناصر بن جائے اور غیب سے ان کی مدد کرے، ملت اسلامیہ کی ناک رکھنے والے ترکی کو ایک بار پھر سرخرو کرے اور اس کی عظمت رفتہ کو بحال فرمائے۔

☆☆☆

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑پیام سیرت

چلے بھی آؤ کہ ہم انتظار کرتے ہیں

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''ارے اولوگو!.....سنو!.....تمھارا محبوب آ گیا''۔

آج گرمی کی شدت آگ برسا رہی تھی۔

کڑی دھوپ تھی۔

درختوں .....مکانوں.....اور .....ٹیلوں کا سایہ دھوپ کی چمک میں گم ہو چکا تھا۔

راستوں کی آمد و رفت اور گھروں کا شور وغل تھم چکا تھا۔

وہ لوگ گھنٹوں انتظار کے بعد اپنے اپنے گھر لوٹ چکے تھے۔

یہ ان کا ہر روز کا معمول تھا۔

وہ ہر صبح شہر کے راستوں پر آ کے کھڑے ہو جاتے.....آنکھیں پھیلا پھیلا کے دور کسی کی آمد کو تکتے۔

وہ درختوں کے سایے میں بیٹھ جاتے اور گھنٹوں اپنے محبوب کا انتظار کرتے۔

اس کے بارے میں محبت کی باتیں کرتے۔

انھوں نے ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا۔

ان کے دل شوقِ دید سے بے کَل تھے۔

ان کی آنکھیں اس کی زیارت کو بے تاب تھیں۔

ان کا رواں رواں اس کی محبت میں جل رہا تھا۔

وہ سراپا شوق.....اور.....سراپا انتظار تھے۔

وہ دیدۂ ودل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔

ان کا بس چلتا تو وقت کی طنابیں کھینچ دیتے۔

ان کا زور چلتا تو وہ راستوں کے فاصلے سمیٹ دیتے۔

اگر وہ کر سکتے تو ہوا کے دوش پہ سوار.....اس کی قدم بوسی کو حاضر ہو جاتے۔

جوان کے بال وپَر ہوتے تو اڑ کر اس کے پاس پہنچ جاتے۔

مگر وہ بے بس تھے.....یہ سب کچھ ان کے بس سے باہر تھا۔

اگر ان کے بس میں کچھ تھا تو بس انتظار.....انتظار.....اور صرف.....انتظار۔

اور وہ کئی روز سے یہی کر رہے تھے۔

صبح صبح آتے.....کوئی پتھر پہ بیٹھ جاتا.....کوئی درخت کی ٹہنی پکڑ لیتا.....کوئی کسی پتھر کی اوٹ لے لیتا۔

جسے سایہ مل جاتا، وہ سایے میں بیٹھ جاتا.....اور جو اس سے بھی محروم رہتا، وہ دھوپ میں ہی تپتا رہتا۔

دھوپ کی تپش ان کے بدن سے پسینے کی جتنی بوندیں ٹپکاتی.....ان کا شوق دید اتنا ہی بڑھتا جاتا۔

کہتے ہیں کہ پانی آگ کو بجھاتا ہے.....مگر.....ان کے پسینے کی بوندیں تو ان کی آتشِ محبت کو اور تیز کر جاتیں۔

وہ ہر دن آتے .....اور جب سایہ ختم ہو جاتا.....تو وہ اپنے گھروں کو واپس لوٹ جاتے۔

اگلی صبح پھر آتے اور پھر انتظار کرتے۔

ہر شام کو وہ مایوس ہو کر لوٹتے .....اور.....ہر صبح ان کا شوقِ دید پھر آنکھ کھول لیتا۔

آج بھی وہ مایوس ہو کر لوٹ گئے تھے۔

ابھی وہ گھر پہنچے ہی تھے کہ ایک یہودی نے بآواز بلند انھیں یہ مژدۂ جاں فزا سنایا۔

یہ سننا تھا کہ ان کے دل دھک دھک ہونے لگے۔

آنکھوں میں خوشی کی عجیب سی چمک آ گئی۔

قدم خود بخود اُس راستے کی طرف اٹھ گئے۔

آج وہ اپنے محبوب سے ملنے والے تھے۔

آج وہ اپنے مسیحا کی زیارت سے بہرہ اندوز ہونے والے تھے۔

انھوں نے سنا تھا کہ اہل مکہ نے ان کے حبیب پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں۔

انھیں علم تھا کہ اہل طائف نے ان کے 'عزیز از جان ودل' کو بہت ستایا ہے۔

انھیں پتہ تھا کہ ان کے جان جاناں کو قریش نے اس کے گھر سے نکال دیا ہے۔

انھوں نے یہ سب سن رکھا تھا اور اس چیز نے ان کے کلیجے کو زخمی کر دیا تھا۔

آج وہ اپنے محبوب کے زخموں پر مرہم رکھنے والے تھے۔

آج وہ اہل مکہ کی جفا کا بدلہ اپنی جاں نثاری سے دینے والے تھے۔

آج وہ طائف کی بدسلوکی کا غم اپنی فداکاری سے دور کرنے والے تھے۔

وہ پھول برسا رہے تھے.....ترانے گنگنا رہے تھے.....نغمے گا رہے تھے۔

ان کی زبانوں پر پیار و محبت کے گیت تھے اور ہاتھوں میں دف۔

آنکھوں میں سرورِ عشق تھا اور دلوں میں نورِ محبت۔

آج تو مدینے کی قسمت کھل گئی تھی۔

خالق کائنات نے اپنی تخلیق کا سب سے خوب صورت نمونہ اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔

آج مدینے کی خوشی لائقِ دید اور اس کے نغمے قابلِ شنید تھے۔

آج تو مدینہ کائنات کے ذرے ذرے سے اپنے فخر کا اظہار کر رہا تھا۔

فرشِ زمین کا کونہ کونہ اس کی قسمت پر رشک کناں تھا۔

اور تو اور.....مدینہ آج مکے پر فخر کناں تھا۔

محبوب داخل ہوا تو ہواؤں نے اپنے تیور بدل لیے۔

بادِ سموم کی جگہ بادِ نسیم چلنے لگی۔

افقِ مدینہ پر نور کی کرنیں بکھر گئیں۔

خاکِ مدینہ کی قسمت جاگ اٹھی۔

آج غبارِ راہ کو فروغِ وادیِ سینا کی بخشائش مل گئی۔

آج شہر یثرب کو طیبہ کا لقب مل گیا۔

آج یثرب کے باسیوں کو انصار کا اعزاز دے دیا گیا۔

انصار!.....اوہ.....تم جانتے بھی ہو یہ کیسا اعزاز ہے!!

آگے چل کر اِن سے ہی کہا جانے والا تھا ''کیا تم پسند نہیں کرتے کہ لوگ سیم وزر کے ڈھیر لے جائیں اور تم اپنے ساتھ خدا کا رسول لے جاؤ''۔

انھیں حبیبِ خدا مل گیا تھا.....اس سے بڑی دولت اور کیا ہو سکتی ہے!!

اُن سے ہی کہا گیا: ''اگر ہجرت نہ ہوتی تو محمد ﷺ بھی انصار کا ایک فرد ہوتا''۔

اے مکہ والو!.....تم نے کیسے اپنی قسمت پر کلہاڑی ماری!

جو درِ یتیم تمھیں دیا گیا تھا.....آہ.....تم اس کی قدر نہ کر سکے!

جو لعلِ آمنہ تمھارے دامن میں ڈالا گیا تھا.....افسوس.....تم اس کی قیمت نہ پہچان سکے!

اے قریش!.....اوس وخزرج تم سے بازی لے گئے۔

اے طائف!.....قبا کی بستی تجھ پر فوقیت لے گئی۔

اے سرزمین طائف!.....کل تو نے جس کے قدموں کو خون آلود کیا تھا.....قبا آج اسی کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر رہی ہے!

اے شعب ابی طالب!.....کل تو نے جسے قید کر لیا تھا.....قبا کی گھاٹیاں آج اسی کے لیے اپنا دامنِ دل پھیلائے ہوئے ہیں!

اے ابوجہل وعتبہ!.....کل تم نے جس پر پتھر برسائے تھے

.....آج اسی پر اسید ومعاذ پھول نچھاور کررہے ہیں۔

کوئی تمھاری قسمت پر روئے بھی تو کیسے!!

کوئی تم پر افسوس کرے بھی تو کیوں کر!!!

اے مدینہ!..... تجھے مبارک..... ہزار بار مبارک!

اے قبا!..... تجھے آفریں.....صد آفریں!!

اے انصار!.....تمھاری خوش قسمتی پر کوئی حسد کیسے نہ کرے!!

اے اہل مدینہ!.....تمھارے نصیب پر کوئی رشک کیوں نہ کرے۔

تم نے جو دولت پائی ہے.....وہ ہے ہی لائقِ رشک وقابلِ حسد۔

تم ناز کرو.....تمھیں حق ہے اگر تم ایسا کرو۔

آج خدا کا لاڈلا رسول تمھارا مہمان ہے.....تم خوشی کے جام پیو اور پلاؤ۔

اے ابوایوب! .....تو اگر اپنے گھر کے درودیوار کو چومے.....تو تجھے حق ہے۔

''اے اللہ کے رسول!.....آپ ہمارے گھر تشریف لے چلیے.....آپ ہمارے غریب خانے پر قیام فرمائیے''۔ ہر شخص آگے بڑھتا اور آپ کی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر اپنے یہاں قیام کی فرمائش کرتا۔

آپ اس سے فرمادیتے کہ اسے چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔

یہ قصہ ہے رسول اکرم ﷺ کی ہجرت مدینہ کا۔

جب مکے نے آپ ﷺ کے لیے اپنے دامن کو تنگ کرلیا.....اور.....سخاوت وفیاضی کے دعوے دار آپ کے وجود کو برداشت نہ کرسکے.....تو آپ ﷺ نے مکہ کو الوداع کہہ کر مدینے کی طرف ہجرت فرمائی۔

ادھر جب اہل مدینہ کو آپ کی روانگی کا علم ہوا تو وہ سراپا شوق وسراپا انتظار بن گئے۔

انھوں نے جس طرح آپ کا استقبال کیا.....وہ مثال بن گیا۔

آپ ﷺ نے پہلے چودہ دن قبا میں قیام فرمایا۔اس کے بعد مدینہ تشریف لے گئے۔

قبا سے مدینہ پہنچے تو بھی زبردست استقبال کیا گیا۔ عورتیں، بچے اور بچیاں چھتوں پر چڑھ گئے۔

سب آپ کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھے۔

بچے بچے کی زبان پر استقبالیہ ترانے تھے:

طلع البدر علينا من ثنيات الوداع

وجب الشكر علينا مادعا لله داع

ہجرت گو کہ سببِ حزن ہے.....مگر.....انصار کی محبت نے اسے آپ کے لیے وجہِ فرحت بنادیا۔

یہاں آپ کو جفا کی جگہ وفا.....نفرت کی جگہ الفت.....پتھر کی جگہ پھول.....اور.....زخم کی جگہ مرہم ملا۔

مکہ میں آپ نے جو محنت کی تھی .....اس کا ثمرہ یہیں ملنے والا تھا۔

مکے کی گلیوں میں جو خون پسینہ بہایا تھا.....اس کا صلہ یہیں دیا جانے والا تھا۔

اس لیے ہجرت محض ایک مجبوری نہ تھی.....ایک ضرورت تھی۔

مکی زندگی بنیاد تھی.....اور.....مدنی زندگی قصرِ اسلام کی تعمیر۔

بنیاد کے بغیر تعمیر نہیں.....اور تعمیر کے بغیر بنیاد بے فائدہ۔

اب جو قصرِ اسلام کی تعمیر چاہتے ہیں.....انھیں مکے کی بنیادوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

آج مسئلہ یہی ہے کہ ہم مکے سے گذرے بغیر.....ایک دم مدینے میں داخل ہونا چاہتے ہیں۔

یہ فطرت کے بھی خلاف ہے اور اسوۂ نبوی کے بھی۔

☆☆☆

❑ فکر ونظر

عالم اسلام میں شورش کی فکری بنیادیں

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

دنیا میں ہر حرکت وعمل کے پیچھے فکر وفلسفہ موجود ہوتا ہے، ہر نقش کف پا سے کسی ارادہ کا، کسی منزل کا پتہ ملتا ہے، لیکن کم لوگ ہیں جو دریائے آگہی کے شناور ہوتے ہیں اور فکر وفلسفہ پر پڑے ہوئے پردہ سے نقاب اٹھاتے ہیں۔ اکثریت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صرف ظاہر کی آنکھ سے تماشہ کرتے ہیں اور اصل اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کرتے ہیں، اخبارات پڑھنے والے جانتے ہیں کہ افغانستان میں کیا ہو رہا ہے پاکستان میں فوج اور سیکیوریٹی کے لوگ کس سے برسر جنگ ہیں، شام میں کس طرح زمین خون سے لالہ زار ہوئی ہے، خون پانی کی طرح بہا ہے، وہاں ہر سینہ فگار ہے، مصر میں گرفتاریوں کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا ہے اور نہ تشدد کے واقعات میں کمی آتی ہے، تیونس سے لے کر لیبیا اور یمن تک ہر جگہ مشعل جاں روشن ہے اور دار ورسن کا سلسلہ دراز ہے، جس مسلم ملک کو دیکھئے وہاں جشنِ مقتل برپا ہے اور لوگ پابہ جولاں لغزیدہ قدم زنداں کے طرف لے جائے جارہے ہیں، دنیا میں لوگ حیران ہیں کہ مسلم ملکوں میں سکون کیوں عنقا ہے دنیا میں ہر جگہ امن ہے، عالم اسلام میں بدامنی ہے، دنیا میں اظہار خیال کی آزادی ہے لیکن مسلم ملکوں میں لب اظہار پر تالے پڑے ہوئے ہیں، ہر راستہ پر کانٹے بچھے ہوئے ہیں وہاں ہوا کے ہر جھونکے سے بارود کی بو آتی ہے۔ بظاہر چہرے ہنستے ہوئے ملیں گے لیکن دلوں میں ویرانی ہے، فضا میں ہراسانی ہے۔ بظاہر مسلم ملک دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح ہیں لیکن سچ یہ کہ عالم اسلام دنیا کے ملکوں سے بالکل مختلف ہے، پابندیاں ہیں، بیڑیاں ہیں، دار ورسن کا منظر ہے، آتش وآہن سے معمور دشت ودر ہے۔

ان حالات کا تحلیل وتجزیہ کیجئے تو محسوس ہوگا کہ دنیا میں غیر مسلم ملکوں میں شورش بہت کم ہوتی ہے دوسرے مذہب کے لوگ ہر طرح کے سیاسی حالات سے اور سماجی ماحول سے ''ایڈجسٹ'' ہو جاتے ہیں، دنیا کے ملکوں میں مغربی تہذیب ہو، وضعی قوانین ملک میں رائج ہوں، شراب خانے قدم قدم پر ہوں ہر طرف زلفوں کے پیچ وخم ہوں، فواحش ومنکرات کا سیلاب ہو، سودی کاروبار ہو، قانون ہر گناہ کی نہ صرف اجازت دیتا ہو بلکہ سرپرستی کرتا ہو، وہاں حکومت بھی ان سب چیزوں سے راضی اور عوام بھی راضی بہ رضائے حاکم اور راضی برضائے حکومت، لیکن عالم اسلام کا معاملہ مختلف ہے، کیونکہ وہاں دین اسلام کے پیرو بستے ہیں اور دین اسلام میں چرچ اور اسٹیٹ کی جدائی کا تصور نہیں ہے، اسلام میں توحید حاکمیت کا تصور ہے، یعنی جو مسجد میں خدا ہے وہی قانون ساز اداروں اور حکومت

کے ایوانوں میں بھی خدا ہے یعنی صرف مسجد میں عبادت کر لینے سے اسلام مکمل نہیں ہوجاتا ہے، دین کی جامعیت کا تصور شروع سے موجود رہا ہے اور ہر دور میں ایوان سیاست اور حکومت کی اصلاح کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں، حادثہ کربلا ہو یا عبداللہ بن زبیر کی اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوشش سب کے پیچھے وہی جذبہ تھا یعنی یہ کہ حکومت کی گاڑی خلافت راشدہ کے بعد اسلام کی پٹری سے اتر گئی ہے اور اسے دوبارہ پٹری پر لانے کی کوشش کی ضرورت ہے، ہر دور میں لوگوں نے اس اعلی مقصد کے لئے قربانیاں دی ہیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے بقول ماہر القادری ۔

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانہ میں
بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا، سرفروشی کے فسانہ میں

چرچ اور اسٹیٹ یعنی دین وسیاست کی وحدانیت کا تصور ہمیشہ سے تاریخ اسلام میں موجود رہا ہے لیکن عصر حاضر میں جس شخصیت نے اسے طاقتور انداز میں اور مؤثر فکری اسلوب پیش کیا وہ مولانا مودودی کی شخصیت ہے انہوں نے دین عبادت رب اور الہ جیسی بنیادی اصطلاحاتِ قرآنی کی تشریح میں توحید حاکمیت کا پہلو بہت نمایاں کر کے پیش کیا اس موضوع پر مولانا مودودی کی کتاب ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں'' دیکھی جاسکتی ہے، مختلف علمی حلقوں سے اس کتاب پر تنقید سامنے آئی۔ ہندوستان میں مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا وحیدالدین خان نے مولانا مودودی کی فکر پر اپنی کتابوں (عصر حاضر میں دین کی تعبیر وتشریح اور تعبیر کی غلطی) میں تنقیدیں کیں، لیکن قابل لحاظ بات یہ ہے کہ تنقید اس پر تو تھی کہ مولانا مودودی نے اللہ کی صفت حاکمیت کو دوسری صفات ربوبیت اور الوہیت پر غالب کر دیا تھا اور پورے دین کی تشریح حاکمیت کے مفہوم کے زیر اثر کی تھی اس کی وجہ سے دین کی تشریح غیر متوازن ہوگئی تھی لیکن یہ کسی نے نہیں کہا کہ دین کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں یا توحید حاکمیت کا نظریہ بالکل غلط ہے اور دین وسیاست کی راہیں الگ الگ ہیں۔ دین وسیاست کی علاحدگی اور نظریہ خلافت کے انکار کی بات صرف ایک ازہری عالم شیخ عبدالرازق نے کی تھی۔ ان کی کتاب الاسلام واصول الحکم ۱۹۲۵ میں شائع ہوئی تھی ازہر کے ادارہ هيئة كبار العلماء نے کتاب پر سخت احتجاج کیا، کتاب کے خلاف اس قدر ہنگامہ ہوا کہ کتاب پر پابندی لگادی گئی اور ازہر نے شیخ عبدالرازق کی سند واپس لے لی جامع ازہر کی پوری تاریخ میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ کسی ازہری عالم کی سند ضبط کر لی گئی ہو، یعنی اس زمانہ میں مسلمانوں کا ضمیر دین وسیاست کی جدائی کے نظریہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا اور کوئی یہ نہیں مانتا تھا کہ دین اسلام کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تمام صحابہ کا اجماع ہے کہ دینی امامت کا نصب کرنا واجب ہے لیکن آج صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ جو دینی جماعتیں اسلام کے سیاسی اقتدار کی باتیں کرتی ہیں ان کو کئی عرب حکومتوں نے دہشت گرد قرار دے دیا ہے ان عرب ملکوں کے علماء اور عالم اسلام کا دینی حلقہ ان حکومتوں کے فیصلہ سے متفق نہیں اور ان کی ہمدردیاں دینی جماعتوں کے ساتھ ہیں نہ کہ حکومتوں کے ساتھ، اگر ان کا بس چلے تو ان حکومتوں کو بیخ وبُن سے اکھاڑ کر پھینک دیں کیونکہ دلوں پر حکمرانی تو دین کی ہے اور دینی جماعتوں کی ہے نہ کہ عرب حکومتوں کی۔

مولانا مودودی کے یہاں اس موضوع سے متعلق کسی قدر عدم توازن تھا جس پر علماء نے تنقید کی تھی، تنقید یہ تھی کہ انہوں نے توحید الوہیت اور توحید ربوبیت پر توحید حاکمیت کو

فوقیت دی ہے اور یہ درست نہیں ۔ غالبا مولانا مودودی کو یہ موقف حالات کی وجہ سے اختیار کرنا پڑا تھا، انہوں نے محسوس کیا تھا کہ لوگ مسجد وخانقاہ پر مطمئن ہورہے ہیں اور ہر نظامِ حکومت پر راضی ہورہے ہیں اور کسی تبدیلی کی کوشش کو ضروری نہیں سمجھ رہے ہیں، شاید اسی لئے انہوں نے توحید حاکمیت پر زیادہ زور دیا تھا، لیکن یہ خفیف عدم توازن یعنی حاکمیت کے تصور پر زیادہ اصرار زیادہ شدت کے ساتھ اور مبالغہ آمیز انتہا پسندی کے ساتھ بعض دوسری تنظیموں میں داخل ہوگیا، مولانا مودودی نے تو کسی مسلم حکمراں کی تکفیر نہیں کی تھے اور نہ وہ اسے صحیح سمجھتے تھے، مولانا مودودی کی فکر جب سید قطب تک پہنچی تو کسی قدر ان کی تحریر میں اس بارہ خاص میں غلو پیدا ہوا اور الاخوان المسلموں کے عالم شیخ حسن الہضیبی نے ان کی فکر کی تنقید میں "دعاۃ لا قضاۃ" کے نام سے کتاب لکھی، سید قطب کی حد تک تو پھر بھی غنیمت تھا کیونکہ وہ سیکولر ذہن کے لوگوں کو کافر نہیں کہتے تھے، لیکن یہی فکر زیادہ غلو کے ساتھ اور اپنی پوری انتہا پسندی کے ساتھ "جماعۃ التکفیر والھجرۃ" تک پہنچی اور پورے عالم عرب میں پھیل گئی اور القاعدہ کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملا اور پاکستان میں بھی سوات اور وزیرستان میں حکومت پاکستان کے ظلم وستم کے ردعمل میں اس نظریہ کی جماعتیں وجود میں آئیں جن میں طالبان زیادہ نمایاں ہیں پاکستان میں القاعدہ کو بھی فروغ اسی وجہ سے ہوا کہ امریکہ کے دباؤ میں پرویز مشرف نے ضیاء الحق کے لائے ہوئے بہت سے اسلام پسندوں کو فوج سے برطرف کردیا تھا ان فوجیوں نے ردعمل میں القاعدہ میں شمولیت اختیار کرلی، افغانستان میں بھی القاعدہ اور طالبان کا نظریہ بہت بارآور ہوا اس نظریہ کے ماننے والوں نے حکومت کو اور امریکی فوجوں کو ہلاکر رکھ دیا ہے، ان نظریات کے ماننے والوں کے نزدیک اقتدار اب صرف اہل دین کے ہاتھوں میں گوارا کیا جاسکتا ہے اور جو غیر اہل دین اگر حکومت کریں گے اور وضعی قوانین کو، مغربی نظام حکومت کو نافذ کریں گے تو وہ کافر ہیں اور طاغوت کے پیروکار ۔ان کا استدلال قرآن کی اس آیت سے ہے (ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئك ھم الکافرون) یعنی جو اللہ کے نازل کردہ احکام کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں، حالانکہ زیادہ تر علماء کا خیال یہ ہے کہ یہ کفر عملی ہے، کفر اعتقادی نہیں ہے یعنی ایسے شخص کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا لیکن اس کی اصلاح کی جائے گی لیکن انتہاء پسندی کی وجہ سے اور حکام کے ظلم وجور کے ردعمل کی وجہ سے جماعۃ التکفیر والھجرۃ جیسی جماعتیں وجود آئیں جنہوں نے ایسے حکام کو کافر قرار دے کر ان کے ساتھ عدم تعاون کا فتوی دیا اور ان کے قتل کو جائز قرار دیا اور اپنے انتہا پسندانہ نظریات کی زرخیز زمین کی اس آیت کی غلط تفسیر سے آبیاری کی گئی اور حکام کے بارے میں یہ کہا گیا کہ وہ موالات کفر کے بھی مجرم ہیں، موالات کفر کے الزام کی بنیاد پر مصر میں اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ امن معاہدہ کے بعد ۱۹۸۱ میں انور سادات کو قتل کردیا گیا تھا، ان انتہا پسندوں کے نزدیک ایسے حکمرانوں کے خلاف ہر شورش درست ہے اور سعیِ انقلاب واجب ہے، اور حکومتوں کے بے پناہ ظلم وستم کی وجہ سے شورش والا ردعمل اور بھی زیادہ مقبول ہوگیا، اور اسی ردعمل سے القاعدہ اور داعش جیسی تنظیموں کو فروغ ہوا۔ ابتداء میں القاعدہ کی تنظیم دراصل ایک مزاحمتی گروپ کا نام تھا یہ مزاحمتی گروپ مغربی سامراجیت کے خلاف اور فلسطین کی آزادی کے لئے ابتداء میں وجود میں آیا تھا پھر مختلف ملکوں میں حکومتوں کی زیادتی کی

وجہ سے کفریہ حکومت کو ختم کرنا اسکا نصب العین بن گیا، دہشت گردی کی فکری اساس ان ہی انتہاپسندانہ نظریات میں مضمر ہے، ان انتہاپسند جماعتوں میں اوراخوان میں بنیادی فرق یہ تھا کہ انتہا پسند جماعتیں طاقت کے ذریعہ انقلاب کے حق میں تھیں اوراخوان دین کی تبلیغ واشاعت کے ذریعہ رائے عامہ کو ہموار کرکے انتخابات اور جمہوریت کے ذیعہ تبدیلی لانا چاہتے تھے، اخوان کے لوگ مختلف عرب ملکوں میں ایسے ہی معتدل تھے جیسے ہندوستان کی جماعت اسلامی معتدل اور امن پسند اورقانون کی پابند ہے،اخوان اور جماعت اسلامی میں مشابہت بس یہی ہے لیکن عوامی مقبولیت کے اعتبار سے الاخوان المسلمون کہیں زیادہ مقبول عام ہے اور اگر الکشن منصفانہ ہوتوان کے جیتنے کی امید ہوتی ہے۔ یہ ایک معمہ ہے کہ ہندوستان میں الکشن ہوتا ہےتو یہاں کی دھارمک سیاسی پارٹی (بی جے پی) زبردست اکثریت سے کامیاب ہوتی ہے اورسیکولر پارٹی (کانگریس) کو شکست فاش ہوتی ہے اسکے برعکس پاکستان میں الکشن ہوتا ہے تووہاں سیکولر پارٹی (انصاف پارٹی) شاندار کامیابی حاصل کرتی ہے اور جماعت اسلامی سمیت تمام مذہبی جماعتوں کا صفایا ہوجاتا ہے، اب یا تو مذہبی جماعتیں عوام پر وہاں اثر انداز ہونے میں ناکام ہیں یا وہاں کے عوام اتنے بھی مذہبی نہیں ہیں جتنے ہندوستان کے ہندو ہیں، اس راز کواب کوئی مفکر ہی کرے فاش۔ بہرحال یہ تسلیم شدہ ہے کہ الاخوان المسلمون بحیثیت مجموعی امن پسندوں اور قانون کی پابندی کرنے والوں کی جماعت ہے، دہشت گردوں کی جماعت نہیں ہے۔لیکن ناہنجار عرب حکومتوں کو یہ معتدل اخوان بھی گوارا نہ تھے کیونکہ وہ جیت کرآنے کے بعد جمہوری اور شورائی اسلامی نظام لاتے اور عربوں کو صرف اپنا اقتدار اور موروثی نظام عزیز ہے اور وہ اخوان کی مقبولیت سے خائف رہتے ہیں، اسی لئے اس کو دہشت گرد قرار دیتے ہیں، عرب حکومتوں کی اسلام سے بیگانہ روش ہی شورش کو جنم دینے کی ذمہ دار ہے۔اہل دین اور مذہبی فکر کے لوگ مشرق وسطی میں امریکہ کی کٹھ پتلی حکومتوں کواور مغربی کلچر کی ترویج کو برداشت نہیں کرسکتے ہیں، تمام عرب دنیا میں عوامی مقبولیت اسلام پسند لوگوں کی ہے لیکن مسند اقتدار پر بیٹھے ہوئے مغربی تہذیب کے پروردہ اساطین حکومت اسلام کو اقتدار سے دور رکھنا چاہتے ہیں، حال کے عرصہ میں ایک مصری عدالت نے اخوان المسلمین کے ۷۵ افراد کو سزائے موت دی ہے جن میں اخوان کے کئی معروف رہنما شامل ہیں، ان سزا پانے والوں میں اخوان کے مرشد عام محمد بدیع بھی شامل ہیں ان سزاؤں پر عمل ہوا تو گویا جشنِ مقتل ہوگا، ساری دنیا کے اسلام پسندوں اور مذہبی لوگوں میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے، یہی اضطراب مزید شورش کو جنم دے سکتا ہے، شورشیں جب عروج پر پہونچتی ہیں تو پھر تاج اچھالے جاتے ہیں اور تخت گرائے جاتے ہیں، شورشوں سے کبھی کبھی سلطنتوں کے چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہوجاتے ہیں ؎

اسی دریا سے اٹھتی ہے وہ موج تند جولاں بھی
نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے ہیں تہ وبالا

☆☆☆

❑ احوال ترکی

ترکی کے تازہ حالات

اوران کا پیغام اور سبق

مولانا یحییٰ نعمانی
ناظم: دارالعلوم الصفہ، لکھنؤ

ترکی کے انتخابات میں رجب طیب اردوغان صاحب کی واضح جیت پر عموماً اسلامی حلقوں اور مسلم ممالک میں مسرت واطمینان کا اظہار کیا گیا۔ موجودہ حالات میں امت مسلمہ کے لیے یہ کوئی بڑی کامیابی اور فتح چاہے نہ ہو، لیکن بڑی خوشی کی بات ضرور ہے۔ ہم ہزیمت وادبار کے جس دور میں جی رہے ہیں، اس میں کسی اچھی خبر کے لیے مدتوں کان ترستے رہتے ہیں، جب ہر صبح، صبحِ الم اور ہر شام، شامِ غم ہے، تو کچھ عجب نہیں جو چھوٹی سی کامیابی امید کے چراغ روشن کرنے لگے یا بادِ نسیم کا ہلکا سا جھونکا سازِ دل کے تار چھیڑ دے اور بلبل نغمہ سنج ہو اٹھے۔ مسلسل شکست وریخت اور بربادیوں کے ہجوم سے دل رنجور اور جسم چور ہیں۔ ہر کس وناکس مشق ستم کے لیے تیار ہے۔ دوسرے تو کیوں رحم کھاتے؟ اپنوں نے ہی ظلم واستبداد کی زنجیروں میں ملکوں اور قوموں کو کسا ہوا ہے۔ اور دشمنوں کی گودوں میں بیٹھ بیٹھ ہمارے زخموں پر نمک پاشی کی ہے۔ پھر کیوں نہ کسی ایسے کو دیکھ کے آنکھیں ٹھنڈی ہوں جو دشمنوں کی آنکھ کا کانٹا ہے اور جہد للبقاء میں ثابت قدم وظفریاب ہے۔

صرف خوشی ومبارک باد دینے کے بجائے، آج کی مجلس میں ہم اُس کامیابی کی اصل نوعیت جاننے اور اس سے اپنے لیے سبق ونمونہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو ترکی کے عوام، ''جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی'' اور بلا شبہ اس کے زبردست قائد اردوغان صاحب نے، ان کے پیشرو دین کے داعیوں اور سیاست اور سماج میں جد وجہد سے چمٹے رہنے والے اہل صبر وعزیمت اور اہل ایمان وحکمت مجاہدانِ ملتِ ترک نے حاصل کی ہے۔

یہ ایک بڑی چشم کشا وسبق آموز داستان ہے، اس میں عصر حاضر کے چیلنجز اور امت مسلمہ کی کمزور پوزیشن کے مطابق راہ عمل کی بہترین نشاندہی ہے۔ اس میں سبق ہے کہ ممکنہ مواقع چاہے کتنے چھوٹے اور حق وحریت کے حصول کے امکانات چاہے کتنے معمولی ہی کیوں نہ ہوں ان کو استعمال کرنا اور وہیں سے کام شروع کرنا ہی کامیابی اور ظلم واستبداد سے نجات کا واحد راستہ ہے۔ نہ امکانات کو چھوڑ دینا راستہ ہے اور نہ امکانات اور مواقع سے زیادہ کی کوششیں نتیجہ خیز طریقہ ہے۔ یہی دانائی وحکمت کا تقاضہ ہے اور یہی سنت رسول کی بصیرت۔

ترکی ظالم عالمی طاقتوں کے منصوبہ اور پروجیکٹ کا مکمل نمونہ تھا۔ پہلے مالیاتی سازشوں سے اس کی معاشیات کی کمر توڑی گئی۔ اس کو اپنے دشمنوں کا دست نگر بنایا گیا۔ اس پر کمال اتاترک اور اس کی ''اتحاد وترقی پارٹی'' کے دونمبہ یہودی اور منافق حکمراں مسلط کیے گئے۔ عام مسلم قوموں کی طرح دینی

واخلاقی کمزوری کا شکار ترکی معاشرہ دوست ودشمن اور نفع ونقصان کی سمجھ کھو چکا تھا، اس کے پاس ان زبردست سازشوں کے مقابلے کی کوئی سبیل نہیں تھی۔ اصول واخلاق اور دین وملت کے بجائے وہ مادی ''ترقی'' اور نیشنلسٹ ''اتحاد'' کے سراب کے پیچھے بھاگ پڑا۔ پھر جو ہوا اس سے آپ واقف ہیں۔ پوری قوم کو غلام اور مرتد بنانے کا عمل تیزی سے کیا گیا اور جبر واستبداد کے شکنجوں سے کام لیا جانا شروع ہوا۔ مسجدیں بند، اذانیں موقوف، دینی حلیہ جرم اور قرآن کی تعلیم ممنوع قرار دی گئی۔ ترکی زبان کے ریشے ریشے میں اسلامیت کا نم تھا، اپنی اسلامی جڑوں سے اس کو کاٹنے کے لیے بالجبر اس کا رسم الخط لاطینی کروایا گیا۔ مغرب نے اپنے لیے جمہوری نظام اور عوام کی آزادی کو جس قدر پسند کیا ہے، اس نے اس سے کہیں زیادہ اس کا اہتمام کیا ہے کہ مسلم ممالک میں کہیں بھی وہ پنپ نہ سکے۔ ترکی اس کا بھی ایک نمونہ تھا۔ اسلام دشمن اور منافق عناصر کو ملک کی تمام بااثر پوزیشنوں پر معین کیا گیا، خاص طور سے اس کا اہتمام کیا گیا کہ ملک میں ایک طاقت ور فوج ہو، وہ اسلام دشمن ہو اور اس کے ہر بیج کو کچلنے کے لیے ہر دم مستعد رہے۔

دو نسلیں نہیں گزریں تھی کہ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس جبری کفر کے تسلط سے ترکی تہذیبی طور پر مکمل مغربی ملک بن گیا، جس میں اسلامیت خاکستر کی چنگاری کی طرح تھی، مگر دبی اور چھپی تھی۔ عوام شریعت کی پابندیوں سے آزاد اور مغربی طرزِ بود وماند کے عادی ہو گئے۔ اور اس بات کا حقیقی ڈر تھا کہ یہ صورت حال زیادہ دن باقی رہ گئی تو ملتِ ترک کا رشتہ اسلام سے بالکل ہی کٹ جائے گا۔

ان حالات میں ترکی کے مخلصان اسلام نے کام شروع کیا۔

(۱) انہوں نے دوسری اسلامی اقوام کے برخلاف اس نوشتۂ دیوار کو پڑھنے میں دیر نہیں لگائی کہ قوم عملاً اسلام سے دور ہو چکی ہے۔ ایمان ویقین کے بجائے دین کے صرف رسمی مظاہر بچے ہیں، نظام تعلیم، ذرائع ابلاغ اور مغرب کے بین الاقوامی غلبے نے مسلمانوں کی اکثریت کو شدت سے متأثر کیا ہے۔ یہ وقت کسی ہمہ گیر مکمل اسلامی ریاست کے قیام کے لیے انقلابی تحریکیں چلانے کا نہیں ہے، بلکہ قوم کے ایمان کو بچانے کا ہے۔ اس لیے کہ جب آپ کی قوم کی اکثریت ایسے کسی انقلاب کو اپنے اوپر عملاً نافذ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تو آپ کس بودگی پر ظلم وجبر کی قوتوں کا مقابلہ کریں گے۔ ہر مسلم ملک میں مغربی طرز کی آزاد زندگی اور لادینی فکر وخیال کے لوگ ہی معاشروں میں قیادت ورہنمائی کے مراکز پر قابض ہیں، خصوصاً نوجوان نسل کا فکری قبلہ مکہ وحجاز کے بجائے کب کا لندن وپیرس بن چکا ہے۔ یونیورسٹیوں سے لے کر اخبارات تک ہر طرف انہی کی دعوت کا شور اور انہی کے کلچر کی تبلیغ ہے۔

(۲) انہوں نے ایک دوسری حقیقت کو بھی محسوس کیا اور سمجھ لیا۔ اگرچہ وہ عریاں سامنے کھڑی تھی مگر دوسرے لوگ اپنی جذباتیت اور رومانویت کی وجہ سے اسے دیکھنے سے منہ چراتے رہے۔ یعنی یہ کہ مسلم معاشرے اندر سے کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ اخلاقی قوت دم توڑ چکی ہے۔ اتحاد پارہ پارہ ہے۔ نفاق ومکر اور ضمیر فروشی نے ان کو مغرب کی مضبوط اقوام، برق نما (Dynamic) ذہانتوں اور منظم حکومتوں سے دو بدو کشمکش کے لائق نہیں چھوڑا ہے۔ بین الاقوامی خفیہ ایجنسیوں نے اقتدار وحکومت کے تمام مراکز کو اندر سے اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ حکمراں طبقہ یہاں تک کہ افواج تک ایجنٹوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اسلامی ممالک میں کہیں سیاسی استحکام نہیں ہے۔ اس لیے انہوں نے طے کیا کہ یہ وقت

زور آزمائی کا نہیں، قوم کی تعمیر نو کا ہے۔

لہٰذا انہوں نے سب سے پہلے اپنی کل توجہ قوم میں پھر سے اسلام پر یقین، اور اس سے محبت پیدا کرنے پر لگائی۔ اس طرز وطریق کے بانی ترکی کے مردِ مجاہد شیخ بدیع الزمان سعید نورسی تھے۔ انہوں نے اپنے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے حکمراں طبقات کے ساتھ مزاحمت سے کلی پرہیز کیا۔ ان کو قید و بند اور جلاوطنی کی پے بہ پے صعوبتیں اٹھانی پڑیں، مگر انہوں نے اپنے رسائل اور تربیتی حلقوں کے ذریعے ایک خاموش دینی انقلاب کی بنیاد رکھ دی۔ جو سیلاب کی طرح نہیں، مدھم پھوار اور شبنم کی طرح گل ولالہ کو سیراب کرتا رہا۔

مشہور نومسلم امریکی دانشور محترم مریم جمیلہ نے اب سے ۵۳ سال پہلے شیخ نورسی کی تحریک اور دوسری اسلامی تحریکوں کے مقابلے اس کی کامیابی کے راز کو بیان کیا تھا۔ ایک امریکی جریدے کو لکھے گئے خط میں وہ لکھتی ہیں:

بدیع الزماں نورسی کی طاقت کی بنیاد اس بات پر ہے کہ انہوں نے اپنی مشکلات اور مجبوریوں کو سمجھ لیا تھا، اور مسلمان جن حالات میں مبتلا ہیں ان کا حقیقت پسندانہ اندازہ کرلیا تھا، انہوں نے احیائے اسلام کے دوسرے مسلمان رہنماؤں کی طرح اسلام کے عالمگیر سیاسی، معاشی اور سماجی نظام کے شاندار منصوبے تیار نہیں کیے، جن پر عمل کرنے کا مستقبل قریب میں اس وقت تک کوئی امکان نہیں جب تک کہ نام نہاد مسلمان حکمرانوں کی اکثریت اہل ایمان کو بے رحمی کے ساتھ کچلتی رہے گی، اور جب تک موجودہ سماجی خرابیاں، اجنبی اور ملحدانہ نظام تعلیم اور دیگر ذرائع ابلاغ، جن کے نقصاندہ اثرات سے والدین کو اپنے معصوم بچوں کو بچانا بھی ممکن نہیں، ختم نہ ہوجائیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ آج ایک بھی ریاست ایسی نہیں جس کو اسلامی کہا جاسکے، کوئی قوم، کوئی گروہ، حتی کہ ایک خاندان بھی ایسا نہیں ہے جس کو پوری طرح مسلمان کہا جاسکے۔

جب مسلمان نوجوانوں کی اکثریت نے اسلام پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہو، اور مغربیت کو ذوق وشوق سے اور بغیر کسی تنقید کے اندھوں کی طرح قبول کررہے ہوں تو ایسی صورت میں متحدہ اسلامی دنیا، اسلامی بلاک، اور اسلامی اتحاد کی بات کرنا بے معنی ہے۔ بدیع الزماں صاحب کی صاحب بصیرت نگاہ نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ایسے ماحول میں عملی سیاست میں حصہ لینا کارعبث اور بے نتیجہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ صرف سیاسی قوت حاصل کرلینے سے اسلام کا احیا نہیں ہوسکتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سیاسی انقلاب، اسلامی انقلاب کا راستہ نہیں ہے، کیوں کہ ایسے اسلامی انقلاب کو جوابی انقلاب کے ذریعہ ناکام بنایا جاسکتا ہے، اور اس کشمکش کا نتیجہ مزید تشدد اور جبر واستبداد ہوگا۔ لہٰذا:

انہوں نے دانشمندی سے کام لے کر ایک سخت، بے لچک تنظیم قائم کرنے سے احتراز کیا، کیوں کہ اس قسم کی تنظیم پر ایک صاحب اقتدار آمر آسانی سے پابندی لگا سکتا ہے، اس کے رہنماؤں کو قید کرسکتا ہے، اور ان کو پھانسی دے سکتا ہے۔ ایسی تنظیم کے دفتروں کو سربمہر کیا جاسکتا ہے، اور اس کے لٹریچر کو ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے، سعید نورسی نے اس کے برخلاف تبلیغ واشاعت اور اپنی کتابوں کے ذریعہ ہزاروں ترکوں کے دلوں میں ایمان کی جڑیں مضبوط کردیں۔ یہ ایسی تحریک تھی جس پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی تھی، اور ایک ظالم ترین استبداد بھی اس کی تعلیمات کو پھیلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

نورسی تحریک کا طریق کار ایک استبدادی نظام کے تحت، جو مسلمان ملکوں کا مقدر بن چکا ہے، زندگی گزارنے والے مختلف

طبقوں کے لوگوں میں کام کرنے کے لیے انتہائی موزوں ہے، دوسرے ملکوں کی اسلامی تحریکوں کے برخلاف اس نے مخالفانہ ماحول میں پروان چڑھنے کی صلاحیت ثابت کردی ہے۔ اس دعوے میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ آج ترکی میں جو کچھ اسلام باقی ہے بدیع الزماں سعید نورسی کی انتھک اور بے لوث جد وجہد کا نتیجہ ہے، انہوں نے اس بات کا احساس کرلیا تھا کہ جدید دور کے انسان کی سب سے بڑی ضرورت اس میں اخلاقی وروحانی بیداری پیدا کرنا ہے، اور یہ کہ نوجوانوں کو دوسری تمام چیزوں سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ان کے انداز فکر کو مادہ پرستی سے روحانیت کی طرف موڑ دیا جائے، رسائل نور اسی مقصد کے لیے وقف ہیں، دوسری اسلامی تحریکوں کے مقابلے میں جن کو یا تو صاحب اقتدار لوگوں نے دبادیا یا وہ بے حرکت اور غیر موثر بن گئیں اس نورسی تحریک نے اللہ تعالی کی مدد سے محیر العقول کامیابی حاصل کی ہے۔ (ماخوذ از: ترکی کا مرد مجاہد، از: ثروت صولت، مطبوعہ مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی)

اس تحریر کی خاص اہمیت یہ ہے کہ مریم جمیلہ صاحبہ جماعت اسلامی اور اخوان المسلمین کی تحریک سے بہت واقف اور ان کی قیادتوں سے بہت مربوط تھیں۔ جب کسی کو ترکی کی اس تحریک ودعوت کی کامیابی کے معیار اور تاثیر کی قوت کا اندازہ نہیں تھا، مریم جمیلہ اس کو ایک زیادہ کامیاب، بااثر اور نتیجہ خیز نمونے کے طور پر دیکھ رہی تھیں۔

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی کے طریق کار میں ''شکوہِ ترکمانی'' تو نہیں تھا، مگر، کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ''ذہنِ ہندی'' ضرور تھا۔ ترکی میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کا سلسلۂ تصوف (عموماً حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ کے واسطے سے) عام تھا، وہی گویا روحانی مرکز اور سرچشمہ تھا اور مکتوبات مجددیہ ہی (جو تجدید واحیاء دین کی حکمت سے معمور اور سلوک وارشاد کا پورا نصاب ہیں) دینی وروحانی فکر کی اساس تھے۔ رسائل نور ہمارے ان مشائخ کی حکمت سے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت مجدد صاحبؒ کے دور میں بھی حکمراں اکبر بزور طاقت کفر مسلط کرنے پر آمادہ تھا۔ تفصیل کا موقعہ نہیں مگر مختصر یہ کہ ملک ارتداد کے خطرے سے دوچار تھا۔ کافری عزت منداور مسلمانی ذلیل ہورہی تھی۔ حضرت مجدد صاحب نے نہ بادشاہ کی تکفیر کی۔ نہ بغاوت کے امکانات پائے۔ بس خاموش اور تاریخ کی ایک منفرد کوشش میں مشغول ہوگئے۔ ان کے مکتوبات نے وہ کام کیا جو لشکر نہیں کرسکتے۔ کچھ بعید نہیں کہ حضرتِ مجددؒ کے اسی نمونے کو سامنے رکھ کر شیخ بدیع الزماں نورسیؒ نے مکتوبات ورسائل ہی کو اپنا ذریعہ بنایا ہو۔ جن کی قلمی کاپیاں تیار کی جاتیں اور ملک میں پھیلائی جاتی تھیں۔ اور انہی سے دین کے داعی اور ملت میں استقامت کے حاملین تیار کیے جاتے رہے۔

خیر! وقت گزرتا رہا اور دھیرے دھیرے ترکی ایک خاموش ذہنی انقلاب کی طرف بڑھتا رہا، جس کو دین دشمن فوج اور کمالی حکمراں بھی روک نہیں سکے۔ لیکن دینی سرگرمیوں پر پابندیاں برقرار رہیں۔ اہل دین اپنی کمزور پوزیشن سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ یورپ کے دروازے پر ہیں۔ بین الاقوامی طاقتیں ان کے معاملے میں شدید حساس ہیں۔ تاریخ نے ان کے ان خدشات کو یقین اور تجربے میں بدل دیا تھا۔ مگر وہ احتیاط کے ساتھ تعلیم وتربیت کا کام کرتے رہے۔

ان حالات میں اردوغان صاحب نے قوم کے سامنے ایک نیا سیاسی تجربہ رکھا۔ وہ جانتے ہیں کہ ترکی میں ایک بڑی تعداد آزاد خیال لبرلس کی ہے جو سیاست اور ملکی قوانین میں اسلام کو قبول کرنے کے لیے بالکل بھی تیار نہیں ہے۔ اس کی

تعلیم جس نظام ونصاب سے اور تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے اس نے اس کی ذہنی ساخت ایسی بنا دی ہے کہ وہ خالص متشرّع قسم کی حکومت اور ٹھیٹھ اسلامی نظام زندگی سے متنفر ہے۔ اور آج بھی اس نصاب ونظام اور میڈیا میں کوئی بڑی تبدیلی ناممکن ہے۔ اس لیے ان کی جماعت نے اپنے دینی رجحانات کو قطعاً نہ چھپاتے ہوئے بھی، صاف اعلان کیا کہ ان کا سیاسی ایجنڈا نہ اسلامی حکومت کا قیام ہے، نہ خلافت کا احیا، نہ پین اسلامزم کا نعرہ اور نہ جہاد وشہادت کی منزلیں۔ بلکہ وہ موجودہ ترکی کے سیکولر ڈھانچے اور دستور کے اندر رہتے ہوئے ایک ایسا ترکی قائم کرنا چاہتے ہیں، جہاں عدل وانصاف، معتدل معیشت، خوشحالی اور لازمی طور پر مذہبی آزادی ہو۔

انہوں نے اس مرحلے میں یہی حکمت عملی ضروری سمجھی، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: وقت کے معروضی حالات، خصوصا بین الاقوامی طاقتوں کی سطوت وقوت، ان کا معاشی تسلط، اور داخلی نفوذ اور اپنی قوم کے ذہنی ومزاجی رجحانات اور اس کے متنوع طبقوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، جتنا ممکن ہو بس اتنا ہی کرنے کے منصوبے بنائے جائیں۔ اس طرح انہوں نے اپنی قوم کے ان طبقات کو بھی ساتھ میں لینے میں کامیابی حاصل کر لی جو ان سے متفق تو نہیں تھے، مگر استبداد وجبر کے حامی بھی نہیں تھے۔

دوسری طرف انہوں نے ایک مختصر مدت میں اپنے لائق وفائق رفقاء اور پارٹی کے کیڈر کے ذریعے ملک کو ترقی کی نئی منزلوں تک پہنچایا۔ اقتصادی طور پر ترکی تیز ترین رفتار سے ترقی کر رہا ہے، اور اس کی یہ ترقی نچلی سطحوں پر بھی اس طرح نظر آرہی ہے کہ ترکی میں بھلے ہی دنیا کے سرفہرست مال دار شہزادے اور تاجر خاندان نہ ہوں، لیکن نچلی سطح پر خوش حالی میں اضافے کو تمام بین الاقوامی مالیاتی اداروں نے تسلیم کیا ہے۔ نظم ونسق مغربی ممالک کے معیار پر ہے۔ عوامی بہبود وفلاح اور صحت ورفاہ عامہ میں وہ بلاشبہ ہر مسلم ملک بلکہ تمام غیر ترقی یافتہ ممالک سے فائق ہے۔ اس وقت انقرہ میں یورپ کا سب سے بڑا عوامی ہسپتال زیر تعمیر ہے جس میں تقریباً ۴۰۰۰ بستروں کا انتظام ہوگا۔ تعلیم کے شعبے میں ترکش یونیورسٹیاں اپنے اعلیٰ معیار کی وجہ سے یورپ کے طلبہ کے لیے بھی باعث کشش بن چکی ہیں۔ غرض ان لوگوں نے ثابت کیا کہ وہ محض اس لیے اقتدار نہیں چاہتے کہ وہ اسلام پسند ہیں اور اس لیے مسند اقتدار پر ان کے علاوہ کسی اور کی جگہ نہیں۔ بلکہ انہوں نے ثابت کیا کہ وہ ملک میں بہتر نظام اور ترقی پذیر زندگی کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور یہ کہ وہ دوسروں سے زیادہ امین بھی ہیں اور کہیں فائق صلاحیتوں کے مالک بھی۔

اس طرح ترکی ایک ایسا ملک بن سکا جہاں اب اسلام پر عمل اور اس کی دعوت کا استقبال ہے۔ مسجدیں اور قرآنی حلقے آباد ہیں۔ داعیان دین کے لیے کھلے امکانات ہیں۔ عوام میں دینی رجحان بڑھ رہا ہے۔ سیاسی طور پر اس نے ایک بین الاقوامی وزن حاصل کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں وہ طاقت کا توازن پیدا کرنے کا ذریعہ بنا ہے۔ مسلم ممالک کے منافقانہ رویے کے درمیان اس کے حکمراں فلسطین کے مسئلے میں جرأت کے ساتھ علم حق بلند کرتے ہیں۔

اس حقیقت کو پاکستان کے بزرگ عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے بہت پہلے ہی اچھی طرح محسوس کیا اور ایک خطاب میں رجب طیب اردگان اور ان کی پارٹی کی حکمت عملی کی نہایت تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

اس پارٹی نے اسلام کا نام نہیں لیا، اسلام کے نام کے نعرے نہیں لگائے، جلسے جلوس اسلام کے نام پر نہیں کیے، کام سارے

اسلام کے کیے، سب سے پہلے تو انہوں نے یہ کیا کہ لوگوں کو ان کی زندگی میں سہولتیں پیدا کیں، جو مصیبت آئی ہوئی تھی معاشی تباہی و بربادی کی، بدنظمی پھیلی ہوئی تھی، ترقی ملک کی رکی ہوئی تھی، پسماندہ ملک بن گیا تھا اس نے اپنے شہروں کو ترقی دینا شروع کیا، لوگوں کو شہری سہولتیں فراہم کیں، .....لوگ بہت خوش تھے، اور بلدیاتی حکومتوں سے بہت خوش تھے، سڑکیں بنالی تھیں، ہوٹل اچھے بنا لیے تھے، تفریح گاہیں بنالی تھیں، اس میں مسجدوں کی تعمیر کا بھی کچھ کام کروالیا تھا۔.....حکمت سے، اس طریقے سے کام کیا، بلدیاتی انتخاب میں جب دیندار لوگوں کی حکومت کا یہ انداز لوگوں نے دیکھا تو جو مرکزی حکومت کے ملکی سطح پر انتخابات ہوئے تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ لوگ جو دیندار لوگ تھے برسر اقتدار آ گئے، اور آج کل وہی برسر اقتدار ہیں .....صورت شکل سے کوئی نہیں پہچان سکتا کہ یہ عرب ہیں، ترکی ہیں یا انگریز ہیں، داڑھی صاف ہے، وہی کوٹ پتلون لباس ہے، لیکن کام وہ اللہ والوں کا کر رہے ہیں، وہاں کے لوگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ یہ لوگ اعلیٰ درجہ کے ولی اللہ ہیں، صدر اور وزیر اعظم اور وزیر خارجہ دین کا کام کر رہے ہیں۔

.....

غور طلب نقطہ یہ ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب تمام اسلامی ممالک میں دینی کوششیں کمزور پڑتی جارہی ہیں، حکومتوں کا نفاق اور اہل دین پر ظلم وستم بڑھتا جارہا ہے۔ ترکی کیوں کر ایک مختلف منظر پیش کر رہا ہے۔ یہی وہ قیمتی سبق ہے جس سے موجودہ مشکلات کے حل کی راہ نظر آتی ہے۔

(۱) اس کی سب سے پہلی اور بنیادی وجہ ان حضرات کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اور Practical Approach ہے۔ ان کے پیش نظر دو حقیقتیں رہی ہیں:

(الف) پہلی یہ کہ ترکی مکمل طور پر ایک آزاد ملک نہیں ہے، دیگر مسلم ممالک کی طرح اس میں مغربی ممالک کی ایجنسیوں کا نفوذ اور مضبوط پکڑ ہے، فوج اور مقتدرہ میں غیر اسلامی عناصر بہت طاقتور ہیں۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اس وقت کا پہلا کام صرف اتنا ہے کہ ترکی میں آزادی، عدل، اور شفاف سیاسی نظام قائم ہو۔ ملک کو فوج کے تسلط سے آزاد کیا جائے۔ قومی ادارے مستحکم اور آزاد ہوں۔ اس کے برخلاف معاصر مسلم تحریکوں نے امت مسلمہ کے انتشار اور مسلم ممالک کی ہمہ جہتی کمزوریوں کا اندازہ لگانے میں بہت غلطی کی ہے۔ ان کو اپنے ممالک میں مغربی ایجنسیوں کے نفوذ اور طاقت کو مدنظر رکھنا ہو گا۔ ہمارے علماء اور اہل دین کے لیے یہ بہت سبق آموز پہلو ہے۔ یہی ترکی جس میں ''عدالت وترقی پارٹی'' نے زبردست کامیابی حاصل کی اور جو سالہا سال سے ایک مضبوط گہری سیاسی بنیاد رکھتی ہے، اسی ترکی کے ''اندر سے کمزور'' ہونے اور اس میں ''دوسروں'' کی طاقت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ فوج نے جب بغاوت کی تو پتہ چلا کہ آدھی فوج کسی اور کے ہاتھوں میں کھیل رہی تھی اور اس کی وفاداری پر یقین نہیں کیا جاسکتا تھا۔ انقلاب تو آ ہی چکا تھا، بس ذرا سا بچ گیا۔ یہ تو ہمارے ممالک کی کمزوری کا حال ہے کہ آپ کی فوج ہی آپ کی نہیں۔ کیا ایسے ممالک کو آزاد کہا جاسکتا ہے؟ کیا کسی مغربی ملک میں اس کا تصور کیا جاسکتا ہے؟ اور جو آزاد نہ ہو وہ آزاد ہونے سے پہلے اگر آزادی برتنے لگتا ہے تو سزا بھی پا کر رہتا ہے۔ ''ترکِ دانا'' نے اس حقیقت کو تسلیم کر کے کام کی حکمت عملی بنائی ہے۔

حقیقت پسندی کے اس طرز کے علاوہ کوئی راستہ ہمارے لیے نہیں ہے، کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک اندر سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مسلم ممالک کو آزاد

سمجھنا پرلے درجے کی سادگی وناواقفی ہے۔مغربی ایجنسیوں نے ہر ملک اور اس کے ہر ادارے میں پکڑ بنا رکھی ہے۔ ہمارے ملکوں کے تخت پلٹنا، کرسیاں الٹنا، حکم رانوں کے قتل اور فوجی انقلابات ان کے لیے کوئی ناممکن کام نہیں ہیں۔تو پھر مسلم ممالک کے لیے پہلا کام یہ ہے کہ وہ عوام کے تمام طبقات کو ساتھ لے کر اور (Common Minimum Programme) بنا کر اپنے آپ کو آزاد اور مستحکم کریں۔پھر کچھ اور سوچیں۔جب تک مسلم ممالک داخلی طور پر مستحکم اور ان کے ریاستی ادارے، مثلاً فوج، عدلیہ، خفیہ ایجنسیاں، سیاسی جماعتیں اور پالیسی ساز ادارے مضبوط، آزاد اور دنیا کی بڑی طاقتوں اور خصوصا ان کی ایجنسیوں کے نفوذ سے محفوظ نہیں ہوجاتے یہ ممالک (آج کی طرح) مسلسل شکست وریخت کے شکار رہیں گے، ان کے وسائل دوسروں کی قوت وشوکت میں اضافے کا ذریعہ بنتے رہیں گے اور اس وقت تک نہ ان ممالک میں آزادی آسکتی ہے نہ دینی جدوجہد کو سلامتی مل سکتی ہے۔اس لیے کام کی فطری اور لازمی ترتیب یہی ہے کہ مسلم ممالک میں اہل دین تمام طبقات کو ساتھ لے کر پہلے اندرونی آزادی اور استحکام حاصل کریں۔اس کے بعد حکومت وسیاست میں دینی رنگ شامل کرنے کے مرحلے کے بارے میں سوچیں۔اس فطری ترتیب کو نظر انداز کرنا وہ مہلک غلطی ہے جس نے ہمارا بڑا خانہ خراب کیا ہے۔

(ب) ان حضرات نے دوسری یہ حقیقت سامنے رکھی کہ برسہا برس کی غفلت کا نتیجہ یہ ہے کہ خود ترک معاشرے میں (دیگر مسلم ممالک کی طرح) اسلام کے حوالے سے زبردست فکری انتشار ہے۔مغربی طرز تعلیم نے اس کی بڑی تعداد کو مغربی تہذیب وطرز کا عاشق اور مادی افکار کا اسیر بنا دیا ہے۔ اس لیے اگر ہم نے ان طبقات کو جو چاہے ایمانی واعتقادی خلل اور کمزوریوں کے شکار ہیں مگر بہرحال مسلمان ہیں، نظر انداز کیا اور ملک میں اپنے فکر کے مطابق ہی چلنا چاہا تو ''غیر'' اور ''دشمن'' ان کو طبقوں کو ہمارے خلاف استعمال کرلے گا، اور ترکی اس داخلی کشمکش سے کبھی بھی آزاد نہیں ہو پائے گا۔

یہ عصر حاضر کے حالات کا نہایت اہم پہلو ہے۔جب مسلم ممالک میں زبردست فکری وذہنی انتشار ہے۔مغربی استعمار اور پھر مغربی تعلیم نے خود ہمارے عوام کو دینی تحریکوں سے نفور کر رکھا ہے۔وہ اگرچہ عقیدے کے مسلمان ہوں مگر عملی طور پر شرعی زندگی گزارنے کو تیار نہیں، ایسی صورت حال میں اہل دین جب سیاست کے مقابلوں میں دوسرے مسلمانوں کے حریف بن کر سامنے آتے ہیں اور کرسی اقتدار کو چھیننے کے لیے الیکشنی مقابلے ہوتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ دین کو بھی دیگر مسلم طبقات کا، خواہی نخواہی، حریف اور (معاذ اللہ) دشمن بنا دیتے ہیں۔ یہ کیسا خطرناک معاملہ ہے؟ دین کبھی اس پوزیشن کو قبول نہیں کرسکتا کہ اس کے داعی وحامل خود مسلمانوں کے حریف بن جائیں اور اقتدار کی دوڑ میں دیگر مسلم گروہوں سے مسابقت میں مبتلا ہوں۔ کاش مسلم ممالک کے اہل دین اس پر غور کرتے۔آپ دین کا نام لے کر اقتدار کی دوڑ میں دیگر مسلمان پارٹیوں اور طبقات سے مقابلہ کریں گے تو اُن پارٹیوں اور ان کے زیر اثر مسلمانوں کو اسلام سے دور اور اس کے داعیوں اور حاملوں کا مقابل ودشمن بنائیں گے۔اس سے بڑا اور کیا نقصان دین ودعوت کا ہوسکتا ہے؟

محترمان من! اقامت دین کا راستہ یہ نہیں ہے۔راستہ یہ ہے کہ آپ قوم میں دین کو ایسا محبوب بنا دیں، اور عملی دین داری کی ایسی ہوا چلا دیں کہ تمام گروہ دین کی رعایت کرنا ضروری

سمجھیں۔ اور اہل دین کی دینی کوششوں اور محنتوں میں تعاون کریں۔ اس طرح یقیناً اللہ چاہے گا تو وہ وقت ضرور آئے گا جب پوری قوم مکمل اسلام کو گلے لگائے گی۔ اور اس کی شریعت کی بالادستی قائم ہونے میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔

(۲) دوسرا ایک سبق یہ ہے، اور خصوصاً ملت اسلامیۂ ہند کے لیے بھی: ہم دیکھ رہے ہیں کہ ترک معاشرے کی سیاسی ومعاشرتی قیادت دین سے ہمدردی اور عملی تعلق رکھنے والی ایک جدید تعلیم یافتہ نسل کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا علماء ومشائخ سے تعلق ہے اور وہ بھی اس کی مثبت دینی صفات کی قدر افزائی کرتے ہیں۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ رسمی دینی حلقہ ہی سیاست وتمدن کے تمام شعبوں میں ملت کی نمائندگی کرتا نظر آئے۔ مغربیت کی شکار دنیا میں یہ بھی ایک حجاب ہے۔ غلط اور نامعقول چاہے آپ اسے کہیں مگر اس کا انکار ممکن نہیں۔ پورے عالم اسلام میں ''ملائی'' شکلیں یا دین کے داعی اور دینی افکار کے مبلغ، جن کی اصل شناخت ہی دین ودعوت ہے، اقتدار میں تبدیلی وانقلاب کی دعوت دے کر اسلام کو خود بہت سے مسلمانوں کا حریف بنا دیتی ہیں۔ اس غلطی نے گھر کے چراغوں سے گھر میں آگ لگوائی ہے۔

کیوں ایسا نہیں ہے کہ ہمارے سیاسی وتمدنی مسائل کے لیے عام مسلمانوں میں سے لوگ ایک نہایت شریفانہ تربیت پاکر سامنے آئیں، جن کا اہل دین سے حسن ظن اور دینی استفادے کا تعلق ہو۔ مگر وہ عام دین سے دور مسلمانوں اور غیر مسلم حلقوں میں رسائی اور پذیرائی رکھتے ہوں۔ ترکی کے مشائخ نے یہی کام کیا ہے۔

ہمارے یہاں جدید تعلیم یافتہ طبقے سے مسلمانوں کو جو قیادت ورہنمائی، ملّی مزاحمت میں رفاقت اور سرد وگرم حالات میں ہم سازی ملنی چاہیے، عموماً نہیں ملتی۔ یہ ملت کی بڑی محرومی ہے کہ ہمارے جو لوگ جدید دنیا کے آلات ووسائل سے لیس اور اس کے مزاج ومذاق کے مطابق جدوجہد کی اہلیت رکھتے ہیں، ملت ان کی خدمات سے بڑی حد تک محروم ہے۔ علم جدید کے دائرے کے کچھ لوگ میدان میں آتے بھی ہیں تو پہلا کام دین کے مسلّمات میں کتر بیونت اور مشق اجتہاد فرمانے کا کرنے لگتے ہیں! کچھ محترم دانشوروں کی تعداد ضرور اس سے مستثنیٰ ہے، مگر عموماً سب کام علماء اور دینی رہنمائی کے کام کے لوگوں کے ہی حصے میں آتا ہے۔ اس کے اسباب چاہے جو ہوں، مگر یہ صورت حال ہم کو کمزور ثابت کر رہی ہے۔ ملک میں قانونی ودستوری کوششیں ہوں یا غیر مسلم سماجی اور سیاسی گروہوں سے مکالمہ، یا مشترکہ مقاصد کے لیے ان کے ساتھ جدوجہد، سب کام علماء ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخری درجے کی بات ہے کہ مسلمانوں میں عصری تعلیم کے فروغ کی کوششوں کا بیڑہ بھی اس طبقے نے ہی اٹھایا ہوا ہے۔ یہ بڑی نااہلی اور بے عملی کی بات ہے۔ موجودہ ملت ترک ہم کو اپنی اس کمی کا شدت سے احساس دلاتی ہے۔ کاش جلد یہ صورت حال تبدیل ہو۔

(۳) تیسری ایک نہایت اہم وجہ اور ہے۔ ترکی کی قوم ایک بہتر اخلاقی شعور ومعیار کی حامل ہے۔ وہاں قیادتوں کی سطح پر اس طرح ضمیر فروشی اور ذلیل کردار نہیں ہے جیسا دوسرے ممالک میں بار بار نظر آتا رہا ہے۔ دشمنوں کو ہر سازش کے لیے سیاسی قوتوں بلکہ دینی قیادتوں تک میں افراد مل جاتے ہیں۔ مصر میں ہزاروں نہتھے عوام کے خون سے رنگین جو انقلاب آیا جس نے جمہوریت کو قتل کیا اور آزادیوں کو دفن، اس کی پذیرائی کے لیے ازہر کا فتویٰ بھی تھا اور سلفی جماعت حزب النور کی تائید بھی۔ اور پھر بے شرمی کی حد کہ اسلامی دلائل کے

ساتھ۔ یہ بے غیرتی! وہ بھی جبہ ودستار کے ساتھ؟؟

اس کے برخلاف ترکی کا حال ابھی نظر آیا ہے۔ حالیہ انتخابات کے موقعے پر مغرب نے ہر کوشش ہی تو کر لی ہوگی کہ اردوغان نہ جیت پائیں۔ آخر انتخابات سے پہلے ہی بین الاقوامی میڈیا نے اندیشے ظاہر کرنے شروع کیے کہ انتخابات منصفانہ ہونا مشکل ہیں۔ کوشش تھی کہ کسی طرح پھر دخل اندازی کا موقعہ ملے۔ ہزاروں مبصرین کو بھیجا گیا، نتائج کے اعلانات کے بعد افواہیں بھی پھیلائی گئیں کہ الیکشن مشتبہ ہیں۔ پروپیگنڈے کے ذریعے ملک میں بے اطمینانی پیدا کرنے اور ترکی میں تقسیم وتفریق کی آگ بھڑکانے کی سازش شروع ہوئی۔ اگر اپوزیشن ذرا ساتھ دے دیتی تو عوام کے دل میں شبہات پیدا ہوجاتے اور سازشوں کا کھیل شروع ہوجاتا، مگر حریف امیدوار محرم انچے صاحب سے جب یہ سوال پوچھا گیا تو انہوں نے ایسی سازشوں کے پنپنے کا امکان ہی ختم کردیا۔ انہوں نے پوری اخلاقی جرأت سے جواب دیا:

''اردوغان کو واضح اور مکمل اکثریت ملی ہے۔ ۸۰ فی صد سے زیادہ لوگوں نے انتخابات میں حصہ لیا ہے۔ اگر آپ اس کو نہیں قبول کریں گے تو کسے قبول کریں گے؟؟ اگر میں ان نتائج کو قبول نہ کروں اور سڑکوں پر احتجاج کروں تو یہ جمہوریت نہیں ہو گی، یہ اس کا مذاق ہوگا۔ کل اردوغان نے ایک بات کہی، مجھے بڑی اچھی لگی۔ انہوں نے کہا کہ ترکی میں ۸۰ فی صد ووٹ پڑے ہیں۔ جن ممالک میں ۳۰ فی صد لوگ الیکشن میں حصہ لیتے ہیں وہ ہمیں جمہوریت کا سبق نہ پڑھائیں''۔ اردوغان سے بہت سی باتوں میں میرے اختلافات ہیں، مگر ان کا مطلب یہ نہیں کہ ترکی منقسم ہے۔ ہرگز نہیں! کوئی ہمیں تقسیم نہیں کرسکتا۔

یہ قوم کی مضبوطی کی علامتیں ہیں۔ ایسی ہی مضبوطی اس وقت نظر آئی جب فوج نے بغاوت کی تھی۔ کسی سیاسی طاقت نے اس کی تایید کر کے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ عوام اپنی آزادیوں اور حق وانصاف کے لیے پہاڑ بن گئے۔ مغربی ممالک کی اصل طاقت ان کے مقتدر طبقات کی یہی اصول پسندی اور حق شناسی میں ہم پر واضح فوقیت ہے۔ ہم کو مسلم معاشروں میں اصول پسندی، ایمان داری اور حق شناسی کی قدروں کو فروغ دیے بنا کسی کامیابی کا خواب دیکھنا چھوڑنا ہوگا۔ ہم ہندی مسلمانوں کے لیے بھی یہی سبق ہے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ملت پر کچھ گزر جائے، ہم کو ہر وقت اپنی تنظیموں اور اپنی شخصیت کے مفادات وامکانات ہی مقصود رہتے ہیں۔ اس چیز نے ہم کو غیروں کا حقیر کھلونا بنا دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے عاجزی کے ساتھ دعا ہے کہ ہم کو اس بیماری سے محفوظ رکھے۔

.....

جاننا چاہیے کہ ترکی سازشوں اور داخلی وبیرونی خطرات سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے خصوصی طور پر اس کے لیے دعاؤں کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ذہن میں ترکی سے متعلق کچھ خدشات بھی ہیں، کچھ قابل اصلاح پہلو بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن جو اصل پیغام اور سبق حاصل کرنا تھا وہ ان کے تذکرے کے بغیر بھی مکمل حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کاش ان سطروں کا جو عرصے کے غور وفکر کا نچوڑ ہیں دینی وملی حلقوں میں سنجیدگی سے مطالعہ کیا جائے اور ان میں اگر کچھ مفید چیزیں ہوں تو قبول کیا جائے۔

☆☆☆

❑ ماحولیات

ماحول کو پاکیزہ اور اسلامی بنائیے

محمد قمر الزماں ندوی
مدرسہ نور الاسلام، کنڈہ پرتاپ گڑھ

مثالوں اور تشبیہات و تمثیلات سے اگر کسی بات کو سمجھایا جائے تو بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نے مثالوں اور تشبیہات کی مدد سے محسوسات کے ذریعہ غیر محسوس باتوں کو اور جانی اور دیکھی ہوئی حقیقتوں کے ذریعہ انجانی اور ان دیکھی حقیقتوں کو اس طرح سمجھایا ہے کہ عام آدمی بھی اسے سمجھ لے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماحول کی اہمیت اور اس کے اثرات کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھایا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انما مثل الجليس الصالح و الجليس السوء كحامل المسك و نافخ الكير فحامل المسك اما ان يحذيك و اما ان تبتاع منه و اما ان تجد من ريحا طيبة و نافخ الكير اما ان يحرق ثيابك و اما ان تجد ريحا خبيثة (مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب)

نیک و بد ہم نشیں اور دوست کی مثال اسی طرح ہے جیسے مشک والا اور بھٹی پھونکنے والا، پس مشک والا یا تو تجھے مشک کا تحفہ دے دے گا یا تو اس سے مشک خریدے گا، یا پھر کم از کم اس کے پاس بیٹھنے سے تجھے عمدہ خوشبو تو سونگنے کو ملے گی ہی، اور بھٹی پھونکنے والا یا تو تیرے کپڑوں کو جلا دے گا اور یا (کم از کم) اس کے پاس بیٹھنے سے تجھے بدبو سونگھنا پڑے گی۔

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مثال دے کر سمجھایا ہے کہ انسانی زندگی میں ماحول و اطراف، اچھے برے لوگوں کی صحبت و ہم نشینی اور گرد و پیش کا بڑا اثر پڑتا ہے، انسان جس ماحول میں رہتا ہے ویسے ہی اثرات اس کی زندگی پر پڑتے ہیں، انسان اگر میدانی اور ہموار علاقہ میں رہتا ہے یا شہری اور متمدن ماحول میں رہتا ہے تو اس کی زندگی میں بھی وہ اثرات نمایاں رہتے ہیں۔ عموماً وہاں کے لوگوں کا ذہن معتدل اور ہموار ہوتا ہے، ان کے اندر ضد، ہٹ دھرمی، شدت و سختی اور اجڈ پن نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس جو لوگوں پہاڑی، غیر ہموار اور جنگلی علاقوں میں رہتے ہیں یا دیہات میں رہتے ہیں تمدن اور مدنیت سے ان کا سابقہ نہیں پڑتا ان کے اندر گنوار پن، سختی اور شدت زیادہ ہوتی ہے، ذہنی اور فکری اعتدال سے عموماً وہاں کے لوگ محروم ہوتے ہیں۔ ایک حدیث شریف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من سكن البادية فقد جفا جو دیہات کا رہنے والا ہوتا ہے یعنی دیہاتی آدمی وہ سچ مچ سخت مزاج اور ضدی ہوتا ہے۔

شروع شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بدوی صحابی ملنے آتے تھے ان کی گفتگو اور ان کا انداز کلام سخت ہوتا تھا، لیکن

بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کیمیا اثر نے ان کی زندگی اور ماحول میں ایک انقلاب برپا کر دیا پھر وہی صحابی دوسروں کے لئے اسوہ اور نمونہ بن گئے۔

معلوم یہ ہوا کہ انسان پر ماحول کا زبردست اثر پڑتا ہے۔ جو خارجی عوامل انسان پر بہت زیادہ اثرات مرتب کرتے ہیں وہ بنیادی طور پر دو ہیں ایک ماحول دوسرا تعلیم۔ تعلیم کے اثرات انسانی زندگی میں کس قدر نمایاں ہیں یہ کسی سے مخفی و پوشیدہ نہیں خاندان کا اگر ایک بچہ پڑھ لکھ کر کامیاب ہوجاتا ہے اور وہ بڑا بن جاتا ہے تو صرف گھر اور خاندان ہی نہیں بلکہ آنے والی نسلوں میں تبدیلی اور انقلاب آجاتا ہے۔

دوسری چیز ہے ماحول: ماحول کے اصل معنی تو ہیں گرد و پیش کے، لیکن ماحول کا مطلب یہ ہے کہ آدمی جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے، فکر و نظر اور عملی زندگی میں ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اس کو ایک مثال سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پانی کی اصل فطرت ٹھنڈا ہونا ہے، وہ نہ صرف خود ٹھنڈا ہوتا ہے، بلکہ دوسرے کو بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے لیکن جب سخت گرمی، لو اور تپش کا موقع ہوتا ہے اور دھوپ کی حدت و شدت اور اس کی تمازت بڑھ جاتی ہے تو پانی بھی گرم ہوجاتا ہے اور پینے والوں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ اسی طرح انسان پر ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ اگر اس کو نیک، شریف اور بااخلاق لوگوں کا ماحول میسر آتا ہے تو اس کی فطری صلاحیت، تقوی اور نیکی پروان چڑھتی ہے اور اس کی خوبیاں دوچند ہوجاتی ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پانی میں برف ڈال دیا جائے کہ اس سے اس کی ٹھنڈک اور بڑھ جاتی ہے۔ اور پھر یہ پانی پیاسوں کے لئے اکسیر بن جاتا ہے۔ اور اس کے برعکس اگر انسان کو ماحول غلط ملے تو وہ خراب ہوجاتا ہے اور اس کے اندر جو خوبیاں ہوتی ہیں وہ بھی بتدریج ختم ہوجاتی ہیں۔ اس کی مثال اس صاف و شفاف پانی کی ہے جس کے اندر کسی نے گندگی ڈال دی ہو۔

یہاں یہ حقیقت بھی ذہن میں رہے کہ انسان فطرتاً نیک ہوتا ہے اس کی فطرت میں بنیادی طور پر خیر ہی کا غلبہ رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر شخص سچائی، عدل، انصاف، دیانت داری، مروت اور شرم و حیا کو قابل تعریف سمجھتا ہے اور ان اوصاف و کمالات کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے، اس کے مقابلے میں جھوٹ، ظلم، خیانت بے حیائی و بے مروتی بخل اور لچڑ پنی کو ناپسند کرتا ہے۔ ایک آدمی اگر جھوٹ بولتا ہے لیکن کوئی دوسرا اس کو جھوٹا کہہ دے تو اس کو تکلیف پہنچتی ہے اور وہ اپنے کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان بے حیائی کا کام کرتا ہے لیکن اپنے عمل پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ یہ دراصل فطرت کی آواز ہے۔ اسی لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بچہ اپنی فطرت کے اعتبار سے اسلام پر پیدا ہوتا ہے یعنی خدا کی فرمانبرداری کے مزاج پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ (مسند احمد: ۱۸۱۷)

معلوم یہ ہوا کہ خارجی حالات کی وجہ سے بہت دفع انسان اپنی اصل فطرت سے ہٹ جاتا ہے اور وہ فطرت کے خلاف چیزوں کو اختیار کرنے لگتا ہے بلکہ کر لیتا ہے۔

ماحول و معاشرہ (خاندان و قبیلہ) اور سوسائٹی کا اثر انسانی زندگی پر بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عموماً انسان ماحول اور معاشرے ہی کی پیداوار ہوتے ہیں، بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی سوسائٹی اور اپنے ماحول و اطراف سے بلند ہوکر فکر و عمل کی صلاحیت رکھتے ہوں، عام طور پر ماحول اور معاشرے کا جو رنگ، ڈھنگ اور آہنگ ہوتا ہے اور سوسائٹی میں جو رسم و رواج اور طرز معاشرت اور

زندگی گزارنے کا طور وطریقہ ہوتا ہے افراد بھی شعوری و غیر شعوری طور پر اسی رنگ ڈھنگ میں رنگ جاتے ہیں اور اسی قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔

انسان پر گھر سے باہر کے ماحول میں سب سے زیادہ جن کا اثر پڑتا ہے وہ دوست واحباب اور ساتھی ہوتے ہیں۔ مشاہدہ یہی ہے کہ انسانی زندگی اور اس کے کردار واخلاق پر سب سے گہرا اثر ہم عمر ساتھیوں اور دوستوں کا پڑتا ہے، ساتھیوں کی ذہنیت اور پسندیدگی و ناپسندیدگی کا معیار، ان کے رجحانات و میلانات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں، اسی لئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: المرء علی دین خلیله، فلینظر حدکم من یخالل (ترمذی)

آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے تو اسے غور کرنا چاہیے کہ وہ کس سے دوستی کر رہا ہے۔ ایک دوسری جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوٹوک الفاظ میں متنبہ فرمایا: ایاك و قرین السوء کنت به تعرف (ابن عساکر) تم برے ساتھی سے بچو کیوں کہ تم بھی اسی کے ساتھ پہچانے جاؤ گے۔

صرف ماحول ومعاشرہ ہی کیا انسان پر آب وہوا اور مٹی و علاقہ کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں نیز خورد ونوش اور ستر ولباس پر بھی علاقہ اور آب وہوا کے آثار نظر آتے ہیں۔

میرا آبائی وطن جھارکھنڈ (دگھی گڈا) سابق صوبہ بہار ہے ،چھٹیوں میں جب گھر جاتا ہوں تو پہلے ہی دن دوپہر میں جب دسترخوان چنا جاتا ہے تو دسترخوان پر جو کچھ میسر ہوتا ہے وہ ماحضر ہوتا ہے لیکن روٹی نہیں ہوتی، کھانا کھاتے وقت روٹی کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا اور یہ احساس نہیں ہوتا کہ روٹی بھی دوپہر کے کھانے کا لازمی حصہ ہے۔ اس کے برعکس جب مدرسہ پہنچتا ہوں تو اگر اتفاقیہ بھی دسترخوان پر روٹی نہیں ہوتی، تو ایسا لگتا ہے کہ کھانا ہی نہیں کھایا اور ابھی سیرابی نہیں ہوئی ہے۔ یقیناً یہ آب وہوا اور ماحول کا اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ علاقہ، مٹی اور آب و ہوا کی الگ الگ تاثیر رکھی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ تو بدیع السماوات والارض ہے۔ اس کی خلاقی اور صناعی محیر العقول ہے۔

مجھے یہاں بچپن کی سنی ہوئی ایک کہانی یاد آرہی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جب ماحول اور آب وہوا کے اثرات پر گفتگو چل رہی ہے تو اس کا بھی ذکر کردوں۔

ایک بار ایک مسلم بادشاہ جنگی مہم پر اپنے لاؤلشکر کے ساتھ نکلا، مہم پر نکلنے سے پہلے حسب عادت اپنی والدہ سے ملنے اور دعائیں لینے گیا، والدہ نے ڈھیر ساری دعائیں دیں اور نصیحت ووصیت بھی کی اور خاص طور پر تلقین کی کہ بیٹا! نماز کی پابندی کرنا اور فجر کی نماز کا کچھ زیادہ ہی اہتمام کرنا۔

بادشاہ اپنے لاؤلشکر اور فوجیوں کے ساتھ نکلا اور جب اس علاقہ اور شہر تک پہنچ گیا اور شہر کا محاصرہ کرلیا تو پہلی رات جب وہ خیمہ میں سویا ہوا تھا فجر کی نماز قضا ہوگئی یا تاخیر سے ادا کی۔ اس کو بہت دکھ اور افسوس ہوا کہ والدہ کی نصیحت پر پہلے ہی دن عمل نہیں کرسکا وہ بہت مضطرب اور پریشان ہوا اور ذہن میں یہ بات آئی کہ یہاں کی مٹی میں کوئی ایسی تاثیر تو نہیں ہے؟ سال دوسال کے بعد جب بادشاہ مہم فتح کرکے اور علاقہ پر قابض ہو کر دارالحکومت لوٹا تو اپنے ساتھ انہوں نے وہاں کی تھوڑی سی مٹی بھی لے لی۔ واپسی پر والدہ سے ملاقات کی اور مہم اور لڑائی کی پوری تفصیلات سنائی اور پہلے ہی دن فجر کی نماز قضا ہونے یا تاخیر سے ادا کرنے کا بھی ذکر کیا۔ والدہ کی خدمت سے فارغ ہوکر انہوں نے چپکے سے وہ مٹی ماں کے تکیہ کے نیچے رکھ دی اتفاق دیکھئے کہ اس دن ان کی والدہ کی نیند بھی دیر سے کھلی اور

بالکل اخیر وقت میں فجر کی نماز پڑھ سکیں، صبح کو بادشاہ جب والدہ جان سے ملنے گیا تو ماں بولی بیٹا! آج میری بھی آنکھ دیر سے کھلی اور کسی طرح فجر ادا کرسکی۔ بادشاہ نے تکیہ کے نیچے سے وہ مٹی اٹھائی اور والدہ کو دکھائی کہ یہ اس مٹی کی تاثیر ہے۔ میں یہ مٹی وہاں سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

اس واقعہ کی صداقت اور حوالہ پر مت جائیے بچپن کا سنا ہوا ایک واقعہ تھا جو موضوع سے ہم آہنگ تھا اس لئے اس کو ذکر کر دیا۔ لیکن یہ تو درست ہے کہ ماحول، خاندان اور آب وہوا نیز مٹی کے اثرات انسان پر مرتب ہوتے ہیں۔ ماحول ومعاشرہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے قرآن وحدیث میں اس کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے کہ انسان اچھے ماحول میں رہے اور خراب ماحول سے اپنے کو بچائے۔ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور تم راست گو اور راست عمل لوگوں یعنی سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔ یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ و کونوا مع الصادقین۔ (توبہ ۱۱۹)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت مدینہ کے بعد صحابۂ کرام کو حکم دیا اور تمام مسلمانوں پر یہ ضروری اور لازم کیا کہ وہ اپنے اپنے علاقہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے آئیں چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ اس حکم کے ملتے ہی حجاز بلکہ جزیرۃ العرب کے طول وعرض سے صحابہ ہجرت کرکے مدینہ منورہ آگئے اور یہیں مقیم وآباد ہوگئے۔ لیکن جب فتح مکہ کا موقع آیا تو ایسا نہیں ہوا کہ پورا مدینہ خالی ہوگیا ہو بلکہ مدینہ کا تحفظ خطرہ میں نہ پڑ جائے، اس لیے بہت سے بوڑھے بچے عورتیں اور جوان مدینہ ہی میں رہے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ ہجرت کے حکم کی بنیادی وجہ اور سبب یہی تھا کہ لوگوں کو ایک معیاری اسلامی، دینی اور ایمانی ماحول ملے۔ انہیں پاکیزہ معاشرہ نصیب ہو، وہ لوگوں کو دیکھ کر دین و ایمان کو سیکھ سکیں اور اس ماحول میں رہ کر اعلی اور عمدہ اخلاق کا نمونہ پیش کرسکیں۔ دین اور دنیا کو شریعت کے مطابق کیسے برتیں اس کو جان سکیں۔ یہ ماحول ہی کا اثر تھا کہ جہاں کے لوگ ظلم وزیادتی، قتل وغارت گری، بے حیائی وبے شرمی اور شراب و کباب کے لئے مشہور تھے، جو چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں پر برسوں جنگ کرتے تھے، جہاں بعض خاندان اور قبیلے لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کردیتے تھے اور جہاں لوگ اپنی اولاد کو انتقام لینے کی وصیت کرتے تھے، انہوں نے ایک ایسا پاکیزہ و ایمانی معاشرہ اور ایسی بلند سوسائٹی کا نقشہ چھوڑا کہ انبیاء کرام کے سوا زمین کے سینے پر اور آسمان کے سائے میں اس کا کوئی نمونہ نہیں ملتا، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بافیض صحبت اور ماحول کا ہی اثر تھا۔ (مستفاد از: بچوں کی تربیت کیسے کریں؟)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز سے اور مختلف طریقوں پر ماحول سازی اور معاشرے کو دینی، ایمانی اور اسلامی بنانے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف یہ حکم دیا کہ نیک لوگوں سے تعلق رکھو، ان کی صحبت اختیار کرو۔ نیک لوگوں کو اپنے دسترخوان پر بلاؤ اور دوستی اور دوست کے انتخاب میں نیکی اور شرافت کو بنیاد بناؤ یعنی نیک لوگوں سے دوستی کرو، وہیں اس کے لئے کہ گھر کا ماحول بھی پاکیزہ اور دینی وایمانی رہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ فرض نمازوں کے علاوہ دوسری نمازیں سنت ونوافل گھر میں پڑھو۔ فقہاء اور اہل علم اس کو افضل بتایا ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے: فصلوا ایھا الناس فی بیوتکم فان افضل صلاۃ المرء فی بیتہ الا المکتوبۃ (بخاری شریف حدیث نمبر ۷۲۹۰) اے لوگو! ان نمازوں کو اپنے گھر میں پڑھا کرو اس لئے کہ پنجگانہ نماز چھوڑ کر انسان کی سب سے بہتر نماز

وہ ہے جو وہ اپنے گھر میں پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اور ارشاد منقول ہے کہ گھروں میں نماز پڑھا کرو، اس کو قبرستان نہ بناو(مسلم شریف حدیث نمبر ۷۷۷)

فقہاء کرام نے بھی کتب فقہ میں یہ بات لکھی ہے کہ فرض نمازوں کے پہلے اور بعد میں جو سنتیں ہیں انہیں گھر میں ادا کریں۔و الافضل فی السنن القبلیة و البعدیة اداؤھا فی المنزل۔(حاشیہ الطحطاوی ۱/۰۲)

غور کیجئے کہ مسجد سے زیادہ محترم، قابل تقدیس اور پاکیزہ جگہ کون سی ہوسکتی ہے اور نماز جیسی مہتم بالشان عبادت کے لئے کون سی جگہ اور مقام ہے جو اس سے زیادہ موزوں اور مناسب ہو، اس کے باوجود آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سنن و نوافل کو گھر میں پڑھنے کا حکم دیا۔اس کی وجہ جو بالکل صاف سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سے گھر کا ماحول دینی بنے گا بچے اور گھر کے دیگر افراد بڑوں کو نماز پڑھتے ہوئے اور دعا و تسبیحات میں دیکھیں گے تو وہ بھی نماز پڑھیں گے، بچے بڑوں کی نقل اتاریں گے اور بچپن ہی سے نماز کی اہمیت اور عظمت ان کے دل میں بیٹھ جائے گی اور گھر کا ماحول بھی نماز والا ماحول بنا رہے گا۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو خاص طور پر اس کی ترغیب دی کہ لوگ زیادہ سے زیادہ گھر میں قرآن مجید کی تلاوت کیا کریں چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ بلکہ اس میں تلاوت کیا کرو خاص کر سورہ بقرہ کی۔جس گھر میں سورہ بقرہ پڑھی جاتی ہے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے۔

گھر کے اندر تلاوت کا ماحول بنانے سے ماحول پاکیزہ بنتا ہے اور اس طرح دینی ماحول بنانے میں قرآن مجید کی تلاوت بہت مفید اور موثر ہوتی ہے۔ بچے کے ذہن میں یہ بات بیٹھتی ہے کہ گھر کے اندر تلاوت کرنا عبادت اور ثواب کا کام ہے اس لئے ہمیں بھی تلاوت کرنی چاہیے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھر کے اندر ذکر کرنے کی فضیلت بیان کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مثل البیت الذی یذکر اللہ فیہ ،و البیت الذی لا یذکر اللہ فیہ مثل الحی و المیت۔(مسلم شریف حدیث نمبر ۷۷۹)

جس گھر میں اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے اور جس گھر میں اللہ کا ذکر نہیں ہوتا ان کی مثال زندہ اور مردہ شخص کی ہے۔ اسی طرح شریعت نے اس بات کو بہتر قرار دیا اور پسند کیا کہ گھر میں بھی کوء خاص جگہ نماز کی ادائیگی کے لئے ہو۔اگر نماز پڑھنی ہو تو کوشش کرے کہ وہیں نماز پڑھے۔حدیث اور فقہ کہ کتابوں میں اس جگہ کو مسجد البیت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ماحول کو بگاڑ وفساد سے بچانے کی تدبیر کے طور پر شریعت کے اس حکم کو دیکھا جاسکتا ہے کہ اگر کسی شخص کے مکان یا زمین کے پڑوس میں مکان یا زمین فروخت کی جائے تو پڑوسی کو اس میں حق شفعہ حاصل ہوتا ہے، اگر پڑوسی وہی قیمت ادا کرنے کو تیار ہو ، جو قیمت دوسرا دے رہا ہے تو اس کو پڑوسی کے ہاتھ ہی بیچنا واجب ہے۔(مستفاد از: بچوں کی تربیت کیسے کریں صفحہ ۲۲۲)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

خوف: جس طرح ہم نے ''غصہ'' کے باب میں دیکھا کہ اگر صحیح طریقہ سے تعامل کیا جائے تو بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے اسی طرح خوف کا موضوع بھی ہے، اگر اس موضوع پر بچے کے ساتھ صحیح سلوک کیا جائے اور صحیح رویہ اپنایا جائے تو بچہ خود اپنی ذات سے واقف ہوتا ہے، مثلا بچہ اپنی ماں سے کہتا ہے کہ اس کو رات سے ڈر لگتا ہے یا کسی بوڑھے آدمی کے خیالی تصور سے ڈر لگتا ہے، تو اس کو سمجھانے کے لئے اگر اس سے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ ''تم کو ڈرنے کی کیا ضرورت تم تو بڑے ہو گئے ہو''، اس سے اس کو کوئی خاص نفع نہیں ہوگا، بلکہ اس سے اس کو نقصان یہ ہوگا کہ وہ اپنے احساسات کے متعلق مشکوک ہونے لگے گا، کیوں کہ وہ درحقیقت کسی شے سے خائف ہوگا، اور ماں جو واقعی زیادہ واقف کار ہے وہ اسے نہ ڈرنے کی تلقین کرے گی، پھر وہ اپنے آپ سے سوال کرے گا اور اپنے اندر کے ان احساسات کی ماہیت کے بارے میں سوچے گا کہ واقعی کیا احساسِ خوف کا وجود ہے یا نہیں؟ وہ سوچے گا کہ اگر درحقیقت خوف کے احساسات کا وجود ہے تو بھی وہ شاید کوئی معیوب یا شرمندہ کرنے والی چیز ہیں، اس طرح بچہ نہ ہی صحیح طور پر ان احساسات سے متعارف ہو سکے گا اور نہ ان احساسات کی کیفیت سے واقف ہو سکے گا اور نہ ایسے وقت میں مناسب تعامل سے متعارف ہو پائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ بچے کو ایسے وقت میں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی بات سنے اور اس کو اس طرح کا جواب دے ''کہ میں بھی جب تمہاری عمر میں تھا تو اس طرح کے احساسات سے دو چار ہوتا تھا''، اس کو ایسے موقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے اس طرح تشریح کی جائے کہ انسان کے اندر اس طرح کے احساسات کا پایا جانا ایک فطری امر ہے۔

والدین اور سرپرستوں کو یہ سمجھنا چاہیے کہ بچہ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھتا ہے جن سے اُسے ڈر لگتا ہے، اُس کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر چھوٹا ہے اور اس کو کتنی تکلیف پہنچائی جا سکتی ہے اور وہ کس قدر اپنے بڑوں کی حمایت پر منحصر ہے، اسی لیے اس کو ڈر لگتا ہے کہ کہیں اس کو کوئی جسمانی تکلیف نہ پہنچ جائے، یا کہیں وہ اپنے والدین سے بچھڑ کر تنہا نہ رہ جائے کہ پھر نہ اس کو بچانے والا کوئی ہو اور نہ اس کی حفاظت کرنے والا، ان امور سے فی الحقیقت بچہ کو ڈر لگتا ہے البتہ بچہ ان کو صحیح طور پر بیان کرنے سے عاجز ہوتا ہے، وہ ان احساسات کی کیفیت وہ ماہیت کو بھی نہیں سمجھ پاتا ہے، مگر اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہ خیالی طور پر کوئی دیو ہیکل یا لمبا چوڑا آدمی ہے جس سے اس کو کوئی جسمانی تکلیف پہنچ سکتی ہے، بسا اوقات اس طرح وہ اس وقت ڈرتا ہے جب اندھیرے میں تنہا ہوتا ہے اور اس کے آس پاس اس کے والدین نہیں ہوتے۔

لہذا والدین کو یہ یہ بات سمجھنا چاہیے کہ بچوں کے اس طرح

ڈرنے کا سبب کبھی کبھی خود ماں باپ ہوتے ہیں، چنانچہ جو لوگ بچوں کو مارتے بھی نہیں ہیں وہ بھی اپنے جسم کے بڑے حجم یعنی بڑے ڈیل ڈول کو کچھ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ گویا وہ جس طرح چاہیں بچے کے جسم کے ساتھ تصرف کریں، سچی بات یہ ہے کہ بچے کے چھوٹے سے جسمانی حجم کے سامنے بڑوں کا جسم ''دیوہیکل'' کے ہی مانند ہوتا ہے، ذرا سوچیے کہ کوئی ایسا شخص جو آپ سے بہت زیادہ ڈیل ڈول والا ہو اچانک آپ کے سامنے آجائے اور آپ کو گھورنے لگے تو آپ کیسا محسوس کریں گے، یا وہ آپ کے کسی عمل پر آپ کے سامنے چیخنے لگے تو آپ کا کیا احساس ہوگا؟ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ جب ماں اچانک مداخلت کرتی ہے اور بچے کو کسی کام سے روکنے کے لیے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے تو بچہ کانپ جاتا ہے، سہم جاتا ہے، اگرچہ اس اچانک مداخلت سے ماں کا مقصد صرف بچے کو اس عمل سے باز رکھنا ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں اس کو جو جسمانی تکلیف پہنچنے کا خدشہ تھا اس سے بچانا ہوتا ہے، بچے کا یہی خوف اس وقت دوبالا ہوجاتا ہے جب ماں مداخلت کے ساتھ اس کے سامنے چیخنا اور ڈانٹنا بھی شروع کر دیتی ہے، ایسے موقع پر بچے کو ماں کی شکل میں ایک بارعب انسان نظر آتا ہے پھر اس کے سبب وہ کچھ پریشان ہوتا ہے، حالانکہ یہ وہی ماں ہوتی ہے جو اس پر شفقت کرتی ہے، اس کی ضروریات پوری کرتی ہے، خطرات سے بھاگ کر وہ اسی کی آغوش میں پناہ لیتا ہے، لیکن اب چونکہ اس کو خطرہ ماں کی ہی جانب سے آتا محسوس ہوتا ہے تو پھر وہ کہاں بھاگے اور کسی کے پاس پناہ لے؟ ماں کی طرف سے پیدا ہونے والی خوف کی اس نفسیات کو وہ سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے، پھر اس کے یہی احساسات اس کے خوف کی نفسیات میں مبتلا ہونے کا سبب بنتے ہیں اور توہمات وتخیلات میں اس طرح مبتلا کر دیتے ہیں، کہ پھر وہ اپنے اندر جو پریشانی اور خوف محسوس کرتا ہے اس کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ بات کوئی معنی نہیں رکھتی کہ ماں اپنی اس کوتاہی کو محسوس کر کے کفِ افسوس ملے کہ اس کی وجہ سے بچہ کسی موقع پر ڈر گیا تھا یا اس نے ڈرا دیا تھا، یہ حقیقت ہے کہ بچہ کمزور ہوتا ہے، اس کو جسمانی تکلیف پہنچنے کا فوری امکان ہوتا ہے، لیکن اس حقیقت کے ساتھ یہ ضروری ہے کہ ماں بچے کی تربیت کے لیے پُرعزم اور پختہ ہو، خاص طور سے وہ ان طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو جن کے ذریعہ وہ اس کو مصائب سے بچانے کا اہتمام کرتی ہے اور اس کی سلامتی کا سامان کرتی ہے، بچے کے ڈرنے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں، اس لیے صرف ماں پر ہی اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی ہے، جیسے بہت سے ٹیلی ویژن پروگرام اس کے اندر خوف کی نفسیات پیدا کرنے کا سبب ہو سکتے ہیں، یا کتابوں میں موجود بعض تصویریں یا بعض مہمان یا راستے میں نظر آنے والے بعض اجنبی اس کے خوف کا سبب ہو سکتے ہیں، البتہ جب اس کے اندر خوف کی نفسیات پیدا ہوجائے اور اس کے مظاہر نظر آنے لگیں تو پھر والدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خوف کے اسباب کا پتہ لگانے کی کوشش کریں، کہ گھر میں کوئی ایسا معاملہ پیش آیا یا کوئی ایسی چیز سامنے آئی یا ایسا کیا ہوا جس سے بچہ ڈر گیا ہے، اکثر وبیشتر خوف کے حقیقی اسباب کا پتہ لگانا مشکل نہیں ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ہم معاملہ کو بچے کی ہی نظر سے دیکھیں، کیوں کہ فی الحقیقت وہ جس چیز سے ڈر رہا ہوتا ہے بڑوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور نہ بڑے اس سے باخبر ہی ہوتے ہیں، والدین کو اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ وہ ان اسباب کو اس سے دور رکھیں جس سے اس کے اندر خوف کی نفسیات پیدا ہونے کا خطرہ ہو حتی کہ وہ بڑا ہوجائے، دوسرے اس کو اپنے احساسات بیان کرنے پر آمادہ کریں اور اس پر اس کی حوصلہ افزائی کریں، اس سے اس کا معاملہ آسان ہوجائے گا، اس کا بوجھ کچھ ہلکا ہوجائے گا اور یہ چیز اس کو اس معاملہ کو سمجھنے میں

بڑی مدد کرے گی۔

صحیح بات یہ ہے کہ صحیح سالم اور مطمئن و بے خوف بچہ اگر تنہا پڑ جائے یا کچھ دیر کے لیے ماں باپ سے بچھڑ جائے تو عام طور پر نہ وہ ڈرتا ہے اور نہ پریشانی محسوس کرتا ہے، البتہ اگر وہ اپنی ماں سے کبھی اس طرح کی بات سن لے کہ ''وہ اسے چھوڑ کر دور چلی جائے گی'' تو پھر وہ اس سلسلہ میں اس سے بات کرنے کو ترجیح دیتا ہے اور اس پہلو پر بات کرنا پسند کرتا ہے، اس کے برخلاف ہم غیر مطمئن اور ڈرنے والے بچے کو یا کسی ایسے بچے کو جس کے والدین کسی موقع پر کسی وجہ سے اسے تنہا چھوڑ گئے ہوں، دیکھتے ہیں کہ وہ اس بات سے ڈرتا ہے، اسے یہ خیال ستانے لگتا ہے کہ کہیں اس کے والدین اس کو پھر نہ تنہا چھوڑ جائیں، چنانچہ اگر کسی بچے میں اس طرح کے پریشان کن احساسات پائے جاتے ہوں تو پھر ان کے اسباب کو تلاش کرنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جب وہ چھوٹا تھا اور اس نے کسی موقع پر اپنے والدین میں سے کسی کی نافرمانی کی تھی تو انھوں نے اس کو چھوڑ کر جانے کی دھمکی دی ہو؟ یا والدین کی ازدواجی زندگی میں کوئی ایسا مسئلہ رہا ہو جس سے بچہ بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار ہو؟ یا مثلاً ماں قضائے حاجت کے لیے اس کو دوسرے کے پاس چھوڑ کر جاتی ہو؟ اگر آپ اس کی اس نفسیات کے پیدا ہونے کا صحیح سبب جان لیں گے تو آپ کے لیے یہ آسان ہوگا کہ پھر آپ اس کے اثرات کو کم کرنے اور اس کے آثار کو زائل کرنے کی کوشش کریں۔

کبھی کبھی بچے کے اندر اس طرح کی نفسیات پیدا ہونے اور اس کے بے اطمینانی کی کیفیت سے دوچار رہنے کا سبب یوں بھی ہوتا ہے کہ ماں اس کو کسی کام سے باز رکھنے کے لئے بار بار اس سے پیار نہ کرنے کی دھمکی دیتی ہے، یوں کہتی ہے ''اگر تم ایسا کروگے تو میں تم کو کبھی بھی پیار نہیں کروں گی''، حالانکہ بچہ کو حقیقی طور پر مطمئن رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کیا جائے کہ حالات جو بھی ہوں اور وہ جو کچھ بھی کر لے مگر اس کے والدین اس سے ہمیشہ محبت کریں گے، ان کی محبت تو دائمی اور غیر مشروط ہے، یہ محبت ہر طرح کے اصول وقانون اور حدود وقیود سے بالا ہے، بچے کے پرسکون و مطمئن ہونے کے لئے اس کے اندر اس طرح کا احساس پیدا کرنا لازمی ہے، اس طرح وہ اس خطرے سے بالکل مطمئن ہوجائے گا کہ وہ ماں باپ کی محبت سے کبھی محروم بھی ہوسکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ والدین خوف کے احساس کو بچے سے دور کرنے کی چاہے جس قدر کوشش کرلیں مگر بعض حالات میں وہ اس احساس سے ضرور دوچار ہوگا اور بعض مواقع پر ضرور ڈرے گا، اس لیے والدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچے کو اس طرح کے احساس کے ساتھ جینے اور اس کو برتنے کا طریقہ سکھائیں، خوف درحقیقت ایک ایسا شدید احساس ہے جو کسی بھی انسان کی زندگی میں کسی بھی موقع پر پورے طور سے غالب آسکتا ہے خواہ وہ انسان بڑا ہو یا چھوٹا، خوف کی نفسیات پیدا ہونے کے قریبی اسباب میں روزمرہ کی زندگی میں پیش آنے والی پریشانی، بے اطمینانی اور ڈر کے مختلف اسباب کو بڑا دخل ہے، بسا اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ایسا سبب نہ پایا جائے جس سے انسان ڈرے تو وہ محض مستقبل کے خدشات سے ہی ڈرتا رہتا ہے، اور یہ سوچ سوچ کر ہلکان رہتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو کیا ہوگا، پھر اس کا کیا حال ہوگا اور اس کے آس پاس کے لوگوں کا کیا حال ہوگا۔

معاشرے میں ایسے بھی والدین ہوتے ہیں جو اگر یہ دیکھتے ہیں کہ بچی میں احساس خوف ہے تو اس کے ساتھ نرمی اور شفقت کا معاملہ کرتے ہیں لیکن بچے میں اس طرح کی نفسیات کو وہ قبول نہیں کرتے، دیکھا جاتا ہے کہ وہ بچے سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ ''بڑوں کی طرح اپنا دفاع کرنا سیکھے، حالانکہ یہ بے

چارے یہ اصول بھول جاتے ہیں کہ انسان کو جب تک یہ نہ معلوم ہو جب وہ بچہ یا لڑکا تھا تو کیسا تھا تب تک وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ آدمی کو کیسا ہونا چاہیے، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے بچے کے اس احساسِ خوف کو قبول کیا جائے، پھر اس طرح اس کے ساتھ اس تعاون کیا جائے کہ وہ اس کیفیت سے نمٹنا سیکھے اور اس کا اثر اس پر کم سے کم ظاہر ہو، جہاں تک بچے کو ''سخت کوشی اور بہادری'' کا عادی بنانے کی بات ہے تو یاد رکھنا چاہیے کہ اس سلسلہ میں تمام بچوں کے درمیان نمایاں فرق ہوتا ہے، چنانچہ کچھ بچے ایسے ہوتے ہیں جو محنت والے اور جسمانی ورزش والے کھیل پسند کرتے ہیں، جبکہ کچھ ان کھیلوں سے دور رہنا پسند کرتے ہیں، بچے کا یہ حق ہے کہ وہ جیسا رہنا پسند کرتا ہے ویسے ہی رہے، عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ باپ اگر ورزشی کھیلوں کو پسند کرتا ہے تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ بچہ بھی ورزش کرے اور اسی کی طرح بنے، جبکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ بچہ اگر باپ سے مختلف پسند رکھتا ہے اور وہ دوسرے طریقے سے رہنا چاہتا ہے تو یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنی پسند کے مطابق رہے، والدین کو اس کی پسند اور ترجیح کو قبول کرنا چاہیے، یہ قطعی انصاف کی بات نہیں کہ اس کو اس کے مزاج اور نفس کے خلاف راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، علم نفسیات کا معروف اور مجرب قاعدہ یہ ہے کہ انسان سے یوں کہا جائے کہ ''وہ جو کچھ ہے اس کو اسی حال میں نظر آنا چاہیے''، اس کی کوشش درست نہیں کہ انسان تصنع اختیار کرے تا کہ وہ جو نہیں ہے وہ نظر آئے یعنی وہ کسی اور کی طرح نظر آئے، آدمی کو اپنے مزاج سے ہم آہنگ ہونا چاہیے اور اپنی شخصی خصوصیات کو بروئے کار لانا چاہیے، اس کو اپنی شخصیت اور شخصی خصوصیات کے ساتھ جینا چاہیے۔

جب والدین بچے کی حوصلہ افزائی کریں گے تو بچہ خطرات اور خوف سے نہ صرف واقف ہوگا بلکہ اس کا سامنا کرنا بھی سیکھے گا، اس طرح خوف کا احساس اس کے اندر کم سے کم ہوتا چلا جائے گا، خوف کی نفسیات دراصل فطری طور پر ایک ردعمل ہوتی ہے، جس کا سمجھنا یا جس کا مقابلہ کرنا اور اپنے آپ سے اس کو دور کرنا ہمارے لیے مشکل ہوتا ہے، اسی لیے جب اسباب خوف کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے تب اس کا مقابلہ کرنا اور اس کے اثرات کو زائل کرنا آسان ہو جاتا ہے، اسی لیے بچے کو اس طرح سمجھانا چاہیے کہ وہ جن چیزوں سے ڈرتا ہے ان میں سے اکثر چیزیں اس کو نہ تکلیف پہنچا سکتی ہیں اور نہ کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں، اس کو سمجھانا چاہیے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح آثار خوف سے چھٹکارا حاصل کر لے گا، وہ چیزیں جو واقعی ڈراؤنی ہوتی ہیں اس طرح ہم بغیر کسی مبالغہ کے ان کی تاثیر بھی کم کر سکتے ہیں، یہاں بچہ جو سب سے اہم سبق سیکھے گا وہ یہ ہوگا کہ ڈر انسانی مزاج کا حصہ ہے، لیکن انسان کے اندر ایسی قوت وصلاحیت بھی موجود ہوتی ہے جس سے وہ اس ڈر کا مقابلہ کر سکتا ہے، البتہ قوت وصلاحیت کو استعمال کرنے کا طریقہ سیکھنے کا ہر شخص محتاج ہوتا ہے، اس اہم سبق کے ساتھ بچہ یہ بھی سیکھے گا کہ ہم کو خوف کا شکار ہونے کے بجائے اپنے آپ کو اس سے آزاد کرنا ضروری ہے۔

بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بچہ کچھ متعین چیزوں سے ڈرتا ہے، اس شکل کو فوبیا (Phobia) یعنی ایک طرح کی دہشت بیٹھ جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے، یہ وہ خوف ہوتا ہے جس سے نجات پانا ممکن نہیں ہوتا، اس کی کوئی تشریح بھی نہیں کی جا سکتی سوائے اس کے کہ جس وقت بچہ اس چیز سے ڈرے اس وقت اس کے خوف کو دور کرنے کے لئے ردعمل ظاہر کیا جائے، مثلاً جیسے کسی بچے کے دل میں چوہے یا کسی اور کیڑے مکوڑے مثلاً کاکروچ وغیرہ کا خوف بیٹھ جاتا ہے، صحیح بات تو یہ ہے کہ بچے کیا بہت سے بڑے بھی ان چیزوں سے ڈرتے ہیں، حالانکہ ان چیزوں سے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا، اس

طرح کچھ لوگوں میں رات، چھری، نہر، ندی وغیرہ کا خوف بیٹھ جاتا ہے، دلوں میں دہشت سما جاتی ہے، چنانچہ اگر ان چیزوں سے ڈرنا یا دل میں ان کا ڈر بیٹھ جانا حقیقت ہے تو پھر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے دل میں کسی بھی چیز کا خوف بیٹھ سکتا ہے، واقعہ یہ ہے اگر کوئی فوبیا کا شکار ہوجائے تو پھر ضروری نہیں کہ وہ جس چیز سے ڈر رہا ہے واقعی وہ ڈرنے کی چیز ہے بھی یا نہیں، یا یہ کہ اس سے ڈرنا بھی چاہیے یا نہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ایک چھوٹے سے کیڑے سے ڈرنے لگتا ہے یعنی اس کیڑے کے متعلق وہ فوبیا کا شکار ہوجاتا ہے، تو اگر وہ اسے ٹیلی ویزن کی اسکرین پر بھی نظر آجائے تو بھی وہ کانپنے لگتا ہے جبکہ وہی شخص اگر چڑیا گھر وغیرہ جائے تو بڑے بڑے جانوروں مثلاً شیر وغیرہ کو دیکھ کر بھی نہیں ڈرتا۔

اسی لیے فوبیا اور خوف کے درمیان فرق کرنا بہت ضروری ہے، چنانچہ فطری خوف کچھ اس طرح ہوتا ہے جیسے انسان کسی کام میں محض نقصان کے خوف سے تردد کرے، یا جیسے کوئی طویل سیڑھی (جو دیوار کے سہارے کھڑی کی گئی ہو) پر چڑھتے ہوئے خوف محسوس کرے تو یہ فطری خوف کہا جائے گا، البتہ اگر کسی کو گھر کے زینے پر چڑھنے میں ڈر لگتا ہو اور اس پر رعشہ طاری ہوجاتا ہو تو پھر یہ شخص فوبیا کا مریض کہلائے گا۔

فوبیا کی علامتیں انسانی زندگی کے کسی بھی موڑ پر ظاہر ہوسکتی ہیں حالانکہ بچوں میں یہ مرض کثرت سے عام ہوتا ہے، تین سال کی عمر کے بعد سے اس کا اظہار ہونے لگتا ہے، مثلاً بچہ دستانوں سے ڈرنے لگتا ہے، بلی دیکھ کر ڈر جاتا ہے یا چھوٹی سی چیونٹی سے بھاگتا ہے، چنانچہ جب بھی یہ چیزیں جن سے وہ ڈرتا ہے اس کے سامنے آتی ہیں اس کی پریشانی بڑھ جاتی ہے اور کانپنے اور مچلنے لگتا ہے، آپ دیکھیں گے کہ وہ ان چیزوں کو ہٹانے اور دور کرنے کا مطالبہ کرنے لگتا ہے، وہ روتا ہے چیختا ہے اور بہت زیادہ تسلی دینے کے بعد ہی مطمئن ہوتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ نفسیاتی خوف یا فوبیا بہت دن تک بچے کے اندر باقی نہیں رہتا، بڑھتی عمر کے ساتھ یہ چیز ختم ہوجاتی ہے اور کبھی کبھی اچانک ہی ختم ہوجاتی ہے، بسا اوقات اس نفسیاتی خوف کا سبب ماضی کا کوئی حادثہ ہوتا ہے، مثلاً زمین پر بچے کے گرنے کے وقت ماں دستانے پہنے ہوئی تھی، یا کسی بلی نے اس کے آگے کبھی چھلانگ لگادی تھی، چنانچہ اب جیسے ہی ماں دستانے پہنتی ہے بس بچہ پر خوف طاری ہوجاتا ہے، یا جیسے ہی بلی اس کے سامنے اچھل کود کرتی ہے بس یہ چیخنے اور بھاگنے لگتا ہے، درحقیقت بچہ دستانے اور بلی سے خوف کا مطلب بھی نہیں سمجھتا مگر انھیں دیکھتے ہی وہ کانپنے لگتا ہے۔

بچے کے اندر سے اس طرح کے فوبیائی اثرات کو کم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ذہن میں ان چیزوں کے دوسرے استعمال وروابط کو بٹھائیں جن سے وہ ڈرتا ہے، مثلاً وہ دستانے سے ڈرتا ہے تو اس کو غسل خانے میں پانی سے کھیلنے کا موقع دیا جائے اس حال میں کے اس کے قریب دستانے رکھے ہوں، اس طرح اس کے دل سے وہ خوف نکل جائے گا جو دستانے کے تعلق سے اس کے دل میں بیٹھ گیا ہے۔

غالب گمان یہی ہے کہ اس طرح کے بچوں کو کسی قسم کے علاج کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وقت گزرنے اور بڑھنے عمر کے ساتھ وہ اس طرح کی نفسیات سے نجات پا جاتے ہیں، کیوں کہ رفتہ رفتہ ان کے سامنے ڈر اور جس چیز سے وہ ڈرتے ہیں اس کا ربط وتعلق واضح ہوجاتا ہے، اس لیے اس دوران کوشش یہ کرنا چاہیے کہ بچہ جن چیزوں سے ڈرتا ہے ان کو اس سے دور رکھا جائے، اور اگر ان اشیاء کا سامنے آنا ناگریز ہو تو پھر اس صورت میں حتی الامکان بچے کو کچھ مزاح اور خوش کن اشیاء کے ذریعہ بہلایا اور سنبھالا جائے۔

☆☆☆

□ انکار حدیث

حضرت ابو ہریرہ پر استاد احمد امین کے اعتراضات

محمد فرید حبیب ندوی

استاد احمد امین نے فجر الاسلام میں جگہ جگہ مستشرقین کی ہم نوائی میں حضرت ابو ہریرہؓ پر نکتہ چینی کی ہے، اور اس کے لیے انھوں نے منافقانہ انداز اختیار کیا ہے، یعنی کھل کر تو مذمت کرنے کی ہمت نہیں کی، مگر موقع بموقع اشاروں میں حضرت ابو ہریرہؓ کو مورد طعن ٹھہرایا ہے۔

ہم ان اعتراضات ومطاعن کو ذکر کرنے سے پہلے حضرت ابو ہریرہؓ کی زندگی کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ آپ کی عظمت ورفعت کا اندازہ ہو سکے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے اصل نام کے سلسلے میں اختلاف ہے، مشہور یہ ہے کہ جاہلیت میں آپ کا نام عبد شمس بن صخر تھا، اسلام لائے تو آپ نے عبد الرحمٰن رکھ دیا، قبیلہ دوس سے تعلق تھا، سات ہجری میں اسلام قبول کیا اور پھر تو رسول اللہ ﷺ کی وفات تک آپ سے آپ ﷺ سے چمٹے رہے، سفر وحضر ہر وقت آپ کے ساتھ رہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ بڑے خوش مزاج اور ظریف تھے۔ ان کی ظرافت کا ایک واقعہ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ جب مدینے کے گورنر تھے تو ایک بار گدھے پر سوار ہوئے، سر پر کھجور کی چھال اٹھا رکھی تھی اور فرماتے جاتے تھے: ''راستے سے ہٹ جاؤ مسلمانوں کا امیر آرہا ہے''۔

اگر چہ آپ یہ صرف ظرافت اور مزاح میں فرمارہے تھے مگر گولڈ زیہر جیسے مستشرق نے اس واقعہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ ضعیف العقل تھے (نعوذ باللہ) اور احمد امین نے بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے گویا اس رائے کو مستحسن قرار دیا ہے۔

آپ نہایت زہد بھری زندگی گزارتے، خود بیان کرتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے حجرۂ عائشہ اور منبر رسول کے درمیان بے ہوش پڑا رہتا، لوگ مجھے پاگل سمجھتے حالانکہ میں پاگل نہ تھا، بس بھوک کا ستم رسیدہ تھا۔

اس روایت میں ایک لفظ ''أحا'' آیا ہے جس کا مطلب ہے کہ میں بے ہوش پڑا رہتا تھا، مگر بعض افترا پردازوں نے اس سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آپ مرگی کے مریض تھے۔

ان سے ہمارا مطالبہ ہے کہ اس پر کوئی دلیل پیش کر کے دکھائیں، کیا تاریخ کی کسی بات سے وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ اس طرح نعوذ باللہ آپ کی روایات کو غیر معتبر قرار دینا چاہتے ہیں۔

آپ نہایت عبادت گزار تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک تہائی رات عبادت میں گزارتے، اور مذکور ہے کہ روزانہ بارہ ہزار تسبیح پڑھتے۔

قوت حافظہ :

حضرت ابو ہریرہؓ ہر وقت حضور ﷺ کے ساتھ رہتے تھے،

اس لیے ان باتوں سے بھی باخبر رہتے جن سے عام مسلمان بے خبر ہوتے ، حضرت ابو ہریرہؓ کا حافظہ شروع میں کمزور تھا ، انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے شکایت کی تو آپ نے ان سے فرمایا: اپنی چادر پھیلاؤ، انھوں نے پھیلا دی، پھر حضور ﷺ نے فرمایا: اب اس کو اپنے سینے سے لگالو، انھوں نے ایسا ہی کیا اس کے بعد وہ کبھی کوئی حدیث نہ بھولے۔

یہ واقعہ بخاری و مسلم جیسی مختلف کتابوں میں ہے۔

گولڈ زیہر کا کہنا ہے کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ سے احادیث بکثرت مروی ہیں تو لوگوں نے انھیں کثرت کے الزام سے بری ثابت کرنے کے لیے یہ قصہ گھڑ لیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ چونکہ ان کے ساتھ حضور ﷺ نے ایسا کیا، اس لیے انھیں احادیث زیادہ یاد رہیں ، حالانکہ یہ واقعہ سراسر جھوٹا ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ خود گولڈزیہر کا یہ دعوی جھوٹا اور بلا دلیل ہے۔اسے چاہیے تھا کہ اپنے اس دعوی پر کوئی دلیل پیش کرتا۔

مگر بات دراصل یہ ہے کہ مستشرقین اور ان کے ہمنواؤں کو حضرت ابو ہریرہؓ کی قوت حافظہ پر تعجب ہوتا ہے ،اس لیے وہ ایسی باتیں کرتے ہیں، حالانکہ اگر وہ انصاف کی نگاہ سے دیکھتے اور علم النفس وعلم الاجتماع کی روشنی میں غور کرتے تو اس میں انھیں کوئی حیرانی نظر نہ آتی ، اس لیے کہ ہر قوم میں کچھ ایسی خصوصیات ہوتی ہیں جو دوسری اقوام میں نہیں ہوتیں۔

قوت حافظہ عربوں کی عظیم خصوصیت ہے ،صحابہ وتابعین میں بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں جو سرعت وقوت حفظ میں یگانہ روزگار تھے ،اور جسے یہ معلوم ہوا کہ بخاری کو تین لاکھ، احمد بن حنبل کو چھ لاکھ اور ابوزرعہ کو سات لاکھ احادیث ازبر تھیں ،تو وہ ابو ہریرہؓ کے حافظہ پر تعجب کیوں کر کرے گا ؟! جبکہ ان کی مرویات کی تعداد صرف ۵۳۷۴ ہے۔

تاریخ میں قوت حافظہ کی بیشمار مثالیں ہیں ، اصمعی کے بارے میں ہے کہ انھیں پندرہ ہزار رجزیہ اشعار یاد تھے ، ہمارے دوست محبّ الدین الخطیب نے علامہ شنقیطی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھیں جاہلی شعرا اور ابوالعلا المعری کے تمام اشعار یاد تھے ،انھوں نے اپنی کتاب ''الوسیط'' جو شنقیط سے متعلق انساب وقبائل کی تاریخ پر ہے، محض اپنے حافظے کی مدد سے لکھی تھی ، ان کی روشنی میں دیکھا جائے تو حضرت ابو ہریرہؓ کی مرویات کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جاتی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے قوت حافظہ کا ثبوت تاریخ سے بھی ملتا ہے، چنانچہ الاصابہ میں ہے کہ ایک سال مروان نے ان سے کچھ روایات سنانے کو کہا، آپ نے سنادیں ، اس نے انھیں لکھ لیا، پھر ایک سال بعد دوبارہ انھیں روایات کو سنانے کی فرمائش کی ، آپ نے پھر سنادیں ، اس نے لکھی ہوئی روایات سے ان کو ملا کر دیکھا تو وہ بالکل ان کے مطابق تھیں۔

صحابہ وتابعین اور دیگر علماء کی حضرت ابو ھریرہؓ کے بارے میں رائے :

☆ طلحہ بن عبیداللہ : ابو ہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے وہ بھی سنا جو ہم نے نہیں سنا۔

☆ ابن عمر: ابو ہریرہؓ مجھ سے افضل ہیں ، اور انھیں ان احادیث کا زیادہ علم ہے۔

☆ عمر: ابو ہریرہؓ ہم سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

☆ شافعی : ابو ہریرہؓ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

☆ بخاری: آٹھ سو اہل علم نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے، وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے حافظ حدیث تھے۔

ان کے علاوہ اور بہت سے علماء ومحدثین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی مدح وستائش کی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ نے بہت سے صحابہ کرام سے روایت کی ہے اور خود ان سے بھی بہت سے صحابہ وتابعین نے اور بقول بخاری آٹھ سو اہل علم نے روایت کی ہے۔ جو ان کے معتمد علیہ اور حافظ حدیث ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

وفات :

۵۷ھ یا ۵۸ھ یا ۵۹ھ میں آپ کی وفات ہوئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں احمد امین کے شبہات:

احمد امین نے حضرت ابو ہریرہؓ کا جو سوانحی خاکہ پیش کیا ہے، اس میں دیانت داری سے کام نہیں لیا، اس نے محض حسب ونسب اور اسلام لانے کا واقعہ اور ظرافت طبع پر روشنی ڈالی ہے مگر جو چیز اصل تھی کہ صحابہ وتابعین اور اہل علم کے نزدیک آپ کا کیا مقام تھا، وہ چھوڑ دی، اس طرح مستشرقین کے انداز میں اس نے آپ کو مورد طعن بنانے کی کوشش کی۔

احمد امین نے حضرت ابو ہریرہؓ پر جو اعتراضات کیے ہیں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت ابن عباس وحضرت عائشہ وغیرہ صحابہ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی بعض روایات کو رد کر دیا تھا۔

۲۔ وہ حدیث لکھتے نہ تھے، محض اپنے حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔

۳۔ وہ بعض احادیث ایسی بھی بیان کرتے جو انھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ نے نہ سنی تھیں۔

۴۔ بعض صحابہ نے کثرت روایت کے سلسلے میں ان پر تنقید کی اور ان کی صداقت میں شبہ کیا۔

۵۔ جب حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت قیاس کے خلاف ہوتی ہے تو احناف یہ کہہ کر کہ ابو ہریرہؓ فقیہ نہ تھے اسے ترک کر دیتے ہیں۔

۶۔ وضاعین حدیث نے حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت سے فائدہ اٹھا کر بہت سی فرضی احادیث ان کی طرف منسوب کر دیں۔

ان اعتراضات کی حقیقت:

۱۔ بعض صحابہ کی حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید:

اس سلسلے میں ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ صحابہ کرام جب کسی کی روایت کو قبول نہیں کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کو جھوٹا سمجھ رہے ہیں، بلکہ اس کی وجہ نظریاتی اختلاف اور استنباط واجتہاد کے مراتب کا فرق ہوتا ہے، یا یہ کہ ایک صحابی کو ایک حدیث یاد ہوتی ہے اور دوسرے کو وہ یاد نہیں ہوتی۔

احمد امین صاحب کی پیش کردہ روایات:

(الف) حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ: ''جو شخص جنازہ اٹھائے وہ وضو کرے''۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا:

''خشک لکڑیاں اٹھانے سے ہمارے لیے وضو کرنا لازم نہیں آتا''

اس سلسلے میں چند باتیں کہی جاسکتی ہیں:

۱۔ اولاً تو یہ حدیث ان الفاظ میں حدیث وفقہ کی کسی کتاب میں مجھے نہیں ملی اور نہ ہی حضرت ابن عباس کی تردید کا یہ واقعہ کہیں نظر آیا، اگر اس کی کچھ حقیقت ہوتی تو لازماً کسی معتبر کتاب میں اس کا ذکر ہوتا، ہاں مسلم الثبوت جیسی اصول کی بعض کتابوں میں اس حدیث کا ذکر ہے مگر ظاہر ہے کہ تنقید حدیث کے لیے کتب حدیث کی طرف رجوع کرنا چاہیے نہ کہ اصول حدیث کی۔

۲۔ یہ حدیث تھوڑے سے فرق کے ساتھ ترمذی میں ہے: ''میت کو غسل دینے والا غسل کرے اور اسے اٹھانے والا وضو کرے''۔ امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ روایت حسن ہے، یہ

روایت حضرت علی اور حضرت عائشہ سے بھی مروی ہے۔ نیز یہ حضرت ابو ہریرہ سے موقوفاً بھی مروی ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابو ہریرہؓ اس روایت میں منفرد نہیں۔

نیز میت کو غسل دینے والے کے بارے میں ائمہ کا اختلاف ہے، بہر حال یہ روایت حسن ہے، مگر شاید ابن عباسؓ کو اس کا علم نہ تھا اس لیے انھوں نے اس سے اختلاف کیا۔ اس لیے احمد امین صاحب کا استدلال مبنی بر غلط ہے خصوصا جب کہ یہ واقعہ ثابت بھی نہیں۔

۳۔ اگر اس حدیث اور واقعہ کو صحیح بھی مان لیا جائے، تو بھی اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابو ہریرہؓ کو طعن دیتے ہیں یا ان کی تکذیب کر رہے ہیں، بلکہ بس بات اتنی سی ہے کہ اس حدیث کے ظاہری الفاظ سے غسل کا وجوب ثابت ہوتا ہے اور وہ اسے استحباب پر محمول کر رہے ہیں اور ان کے الفاظ "لایلزمان" سے بھی اس کی طرف اشارہ ہوتا ہے، اور دونوں فقیہ ہیں، اس لیے اختلاف کا پورا پورا حق ہے۔

(ب) دوسری حدیث:

حضرت ابو ہریرہؓ نے روایت بیان کی کہ:

''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہو تو برتن میں ہاتھ ڈالنے سے پہلے اسے دھولے، نہیں معلوم ہاتھ کہاں کہاں لگا ہو۔ یہ حدیث سن کر حضرت عائشہ نے فرمایا: "ماذا نصنع بالمهراس" پھر ہم پانی سے بھرپور مٹکے کا کیا کریں کہ وہ سارا خراب ہو جائے گا''۔ گویا حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کو قبول نہیں کیا اور ان پر اعتراض کیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے اور بخاری و مسلم و دیگر کتب حدیث میں موجود ہے لیکن ان میں اس تنقید کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ ابن عربی اور عراقی نے بیہقی کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ تنقید (حضرت عائشہ نے نہیں بلکہ) قین التجعی نے کی تھی جو حضرت ابن مسعودؓ کے شاگردوں میں سے تھے۔

یہی روایت جب حضرت ابن عمرؓ نے روایت کی تو ان پر بھی ایک شخص نے اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ: "أرأيت إن كان حوضا" حضرت ابن عمرؓ نے اس کی بات کو ناپسند کیا۔ بے شک وہ سنتوں کی بہت زیادہ پابندی کرنے والے تھے۔

بہر حال اس سے پتہ چلا کہ حضرت ابو ہریرہؓ پر تنقید کرنے والے حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہؓ نہیں بلکہ قین التجعی نام کا ایک تابعی شخص ہے، اور اگر بالفرض یہ جان ہی لیا جائے کہ حضرت عائشہؓ نے ہی تنقید کی ہے، تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ اس مسئلے میں حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہؓ کے درمیان اختلاف رائے تھا، حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے یہ تھی کہ اس موقع پر ہاتھ دھونا واجب ہے اور حضرت عائشہ (وابن عباسؓ) کی رائے یہ تھی کہ واجب نہیں، اس میں تکذیب و شک کی کوئی بات ہی نہیں۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مؤلف فجر الاسلام نے حضرت عائشہ کی اس تنقید کو نقل کرنے میں شرح مسلم الثبوت کا حوالہ دیا ہے، جب کہ اسے نقل کرنے والے مسلم الثبوت کے شارح نہیں؛ بلکہ شارح نے تو صاحب مسلم الثبوت کی اس غلطی کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ تنقید ثابت نہیں۔

اب ذرا احمد امین صاحب کی امانت پر ایک نگاہ ڈال لیجئے، اولا تو انھوں نے حوالہ غلط دیا اور پھر شارح نے جو صاحب مسلم الثبوت کی غلطی واضح کر دی تھی، اس پر کوئی توجہ نہ دی، اس کے پیچھے حضرت ابو ہریرہؓ کی تنقیص شان کے سوا اور کیا محرک ہو سکتا ہے!!

۲۔ حضرت ابو ہریرہؓ حدیثیں لکھتے نہ تھے: یہ اعتراض تو بالکل مہمل ہے اس لیے

کہ حدیثیں نہ لکھنا حضرت ابو ہریرہؓ کی خصوصیت نہیں، بلکہ چند صحابہ کے سوا کوئی بھی نہ لکھتا تھا، یہ بات خود مؤلف نے بھی ایک جگہ (ص۲۷۲) کہی ہے کہ پہلے دور میں حدیثیں لکھنے کا رواج نہ تھا، بلکہ دراومدار حفظ وروایت پر تھا۔

مگر اس چیز کو بھی مورد طعن بنا کر گویا مؤلف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابو ہریرہؓ حدیثیں لکھتے نہ تھے، اس لیے ان کی روایات میں وہم وخطا کا امکان ہے۔

اور اگر ان کا مقصود یہ نہیں ہے تو پھر انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی شان میں صحابہ کرام کی مدح وستائش اور ان کی قصیدہ خوانی سے چشم پوشی کیوں کی۔

نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ دور اول میں کتابت حدیث کو پسند بھی نہ کیا جاتا تھا، بلکہ ان لوگوں کا زیادہ تر دارومدار زبانی حفظ وروایت پر تھا، یہی وجہ ہے کہ علماء اصول کی رائے ہے کہ اگر دو حدیثیں باہم متعارض ہوں ایک زبان بیانی کی ہو اور دوسری لکھی ہوئی شکل میں ہو تو زبانی بیان کی گئی روایت کو ترجیح دی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ وتابعین کی ایک جماعت لکھنے کو پسند ہی نہ کرتی تھی کہ کہیں لوگ لکھنے پر ہی تکیہ نہ کرنے لگیں، امام اوزاعی کا قول ہے: ''یہ علم اس وقت تک معزز رہا جب تک لوگ اسے زبانی روایت کرتے رہے، جب انھوں نے لکھنا شروع کر دیا تو اس کا نور جاتا رہا اور نااہل لوگ اس کے حامل بن گئے۔

اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا حافظہ بلا کا تھا، انھیں کتابت سے سے زیادہ حفظ پر بھروسہ تھا، ان کی قوت حافظہ کا یہ حال تھا کہ وہ کوئی بات سن لیتے تو اسے بھول نہ پاتے، زہری فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسی بات نہ سنی جو میں بھول گیا ہوں۔ اسی طرح حضرت ابن عباسؓ نے عمر بن ربیعہ کا پورا قصیدہ محض ایک بار سن کر یاد کر لیا تھا۔

۳۔ بغیر سنی ہوئی حدیثیں روایت کرنا:

احمد امین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ بہت سی ایسی روایات بھی بیان کرتے ہیں جو انھوں نے براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نہ سنی ہوتیں، مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے یہ روایت بیان کی کہ ''جس شخص نے جنبی ہونے کی حالت میں صبح کی تو اس کا روزہ نہیں ہوگا'' حضرت عائشہؓ نے اس پر نکیر کی اور فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ بحالت جنابت صبح کرتے تھے اور آپ کا روزہ ہوتا تھا، یہ سن کر حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا: ''عائشہؓ کو مجھ سے زیادہ علم ہے، دراصل میں نے یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے نہیں سنی، بلکہ فضل بن عباس سے سنی تھی''۔

یہاں دو باتیں عرض ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ یہ صرف ابو ہریرہؓ کا مسئلہ نہیں بلکہ دیگر بہت سے صحابہ کرام بالخصوص بعد میں اسلام لانے والے ایسا کرتے تھے، چنانچہ وہ ایک دوسرے سے سن کر بہت سی روایات بیان کر دیا کرتے تھے، کیونکہ وہ ایک دوسرے کو صادق القول اور معتبر سمجھتے تھے۔ حضرت براء بن عازب فرماتے ہیں:

''ہم تمام روایات براہ راست رسول اللہ ﷺ سے سن کر نہیں بیان کرتے تھے، بلکہ دوسرے صحابہ کرام سے سن کر بھی روایت کیا کرتے تھے''۔

حضرت انس سے بھی یہ منقول ہے۔ اسی طرح کی روایات کو مرسل کہتے ہیں، اور انھیں حکماً مرفوع سمجھا جاتا ہے، اس سلسلے میں ابو اسحاق اسفرائینی کے علاوہ کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ مرسلِ صحابی مرفوع کے حکم میں ہوتی ہے۔

ابن صلاح نے مقدمہ میں اور امام نووی نے المجموع میں جو کچھ ذکر کیا ہے، اس سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ مراسیل صحابہ حجت ہیں اور وہ مرفوع کے حکم میں ہوتی ہیں، اس لیے کہ اس میں جو راوی ہوتا ہے وہ صحابی ہوتا ہے اور صحابہ سب کے سب

ثقہ اور عادل ہیں، اس لیے ان کے حذف ہونے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

۲۔ اپنی اس بات پر جو مثال پیش کی ہے، اس کے سلسلے میں کئی طرح گفتگو کی جاسکتی ہے:

۱۔ کتب حدیث میں کہیں ذکر نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی تردید کی تھی، بلکہ بات صرف اس قدر ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ روزہ نہیں ہوگا، اور جب یہ سوال حضرت عائشہؓ وام سلمہؓ سے کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ روزہ ہوجائے گا، رسول اللہ ﷺ حالت جنابت میں صبح کرتے جبکہ آپ روزے سے ہوتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کو ان کے اس فتوی کے بارے میں پتہ چلا تو انھوں نے اپنے قول سے رجوع کرلیا اور کہا کہ میں نے یہ روایت فضل بن عباس سے سنی تھی۔

ہر ایک نے اپنے علم کے مطابق فتوی دیا، مسلم کی روایت سے صاف پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کہیں بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی تردید نہیں کی۔

جب مسلم الثبوت نے اس واقعہ کو ذکر کیا ہے اس پر شارح مسلم الثبوت نے صراحت کی ہے کہ یہ واقعہ گو کہ صحیح ہے، مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی تردید کی ہو، مگر تعجب ہے کہ ایک طرف تو احمد امین نے شارح کی اس صراحت سے چشم پوشی کی اور پھر ستم بالائے ستم یہ کیا کہ اس تردید کو خود ان کی طرف ہی منسوب کردیا۔ یہ علمی خیانت نہیں تو اور کیا ہے!!

۲۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کو رد کردیا تھا تو اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو اس روایت کا علم نہ تھا، اور یہ ان پر حضرت عائشہؓ کا استدراک تھا، جیسے انھوں نے دیگر بہت سے صحابہ پر استدراک کیا تھا اور یہ صحابہ کا طریقہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ کرتے تھے۔ اور وہ اسے ایک دوسرے کی تکذیب نہیں بلکہ علمی امانت کی ادائیگی سمجھتے تھے۔

۳۔ اکثر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اس روایت کو مرفوعاً نقل نہیں کرتے تھے بلکہ یہ ان کا ذاتی اختلاف تھا، بہت کم روایات میں اسے مرفوعاً نقل کیا گیا ہے۔

۴۔ ابن حجر فرماتے ہیں:

''حضرت ابو ہریرہؓ نے اس فتوی سے رجوع کرلیا تھا یا تو اس وجہ سے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت دوسری روایات کے مقابلے میں راجح ہے، اور دوسری بات یہ کہ اس میں روزہ درست ہونے کی بات صراحتہً مذکور ہے، جبکہ دوسری روایات میں یہ احتمال موجود ہے کہ شاید غسل قبل از فجر کا حکم استحباباً ہو نہ کہ فرضاً۔ یا حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت عائشہؓ کی روایت کو ناسخ سمجھا''۔

٤۔ صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر اعتراض کرتے تھے''۔

احمد امین لکھتے ہیں:

''صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان پر تنقید کرتے تھے، چنانچہ مسلم میں ہے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں:

تم لوگ کہتے ہو کہ..... ''لوگ کہتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ بہت زیادہ روایتیں بیان کرتا ہے، اور مہاجرین وانصار اس قدر روایت نہیں کرتے، میں تمہیں اس کی وجہ بتاتا ہوں: دراصل میرے انصار بھائیوں کو کھیت کھلیان کے کام کرتے رہتے تھے اور میرے مہاجر بھائی تجارت میں مشغول رہتے تھے، اور میرا حال یہ تھا کہ میں چند

لقمے کھا کر بھی آپ کے ساتھ لگا رہتا جب دوسرے لوگ غائب ہوتے تو بھی میں موجود ہوتا، اس طرح جن روایات کو وہ نہ سن پاتے، میں انھیں بھی سن کر یاد کر لیتا''۔

بعینہٖ یہی الفاظ گولڈ زیہر کے بھی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ احمد امین کے شکوک وشبہات گولڈزیہر کی نگارشات پر مبنی ہوتے ہیں، مگر یہاں احمد امین نے گولڈزیہر سے بڑھ کر زہرناکی دکھائی ہے، چنانچہ گولڈزیہر نے تو یہ کہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر اعتراض تابعین کرتے تھے جبکہ احمد امین نے اس کی نسبت صحابہ کرام کی طرف بھی کی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ مکثر الروایہ ہیں، اور یہ بات اس لیے حیران کن لگتی ہے کہ وہ کافی تاخیر سے اسلام لائے، مگر اس کی وجہ انھوں نے خود بیان کر دی تھی، کہ وہ ہر وقت اللہ کے رسول ﷺ سے چمٹے رہتے تھے، خود رسول اللہ ﷺ نے بھی گواہی دی تھی کہ ابو ہریرہؓ حدیث کے سب سے زیادہ حریص ہیں، نیز انھوں نے کبار صحابہ سے بھی احادیث روایت کیں، اور پھر جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی تو انھوں نے ایک علمی امانت سمجھتے ہوئے دوسروں تک اس ذخیرہ کو منتقل کر دیا۔

یہ ایک فطری بات تھی کہ تابعین اور مدینے سے دور رہنے والے صحابہ کرام کو ان کی اس کثرت روایت پر تعجب ہو، چنانچہ بسا اوقات وہ اس پر اپنی حیرت واستعجاب کا اظہار بھی کر دیتے، اور پھر حضرت ابو ہریرہؓ اس کی وجہ بیان کرتے تو ان کی حیرت رفع ہو جاتی اور وہ مطمئن ہو جاتے۔ مسلم کی مندرجہ بالا روایت میں دراصل یہی بات کہی گئی ہے کہ لوگوں کو اس کثرت روایت پر تعجب ہوتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ کس چیز پر تعجب ہونا الگ بات ہے اور اسے شک وتکذیب کی نظر سے دیکھنا شیء دیگر۔

اب آپ سوچئے کہ احمد امین صاحب کی یہ بات کیسے درست ہو سکتی ہے کہ صحابہ کرام عام طور سے حضرت ابو ہریرہؓ کو تنقید کا نشانہ بناتے تھے، انھوں نے مذکورہ روایت سے جو استنتاج کرنے کی کوشش کی ہے وہ بے محل اور غلط ہے، آخر اظہار حیرت سے تکذیب کیسے لازم آتی ہے۔

نیز اگر صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کو شک وشبہ کی نگاہ سے ہی دیکھتے ہوتے تو انھیں کھلم کھلا روایت کی اجازت کیوں دیتے اور وہ حضرت عمرؓ کے درّے سے کیسے بچ پاتے!! حضرت عائشہؓ ودیگر صحابہ کرام اس پر مہر بہ لب کیسے رہ جاتے، جبکہ وہ کسی غلط بات پر کبھی خاموش نہ رہ سکتے تھے۔

اب رہی یہ بات کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ بات کن لوگوں کے بارے میں کہی ہے کہ انھیں آپ کی کثرت روایت پر تعجب ہوتا ہے، تو الفاظ حدیث سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سابقین اولین، کبار صحابہ نہ تھے بلکہ میرے نزدیک تو راجح یہ ہے کہ وہ صحابہ ہی نہ تھے بلکہ تابعین تھے، اس لیے کہ اگر وہ صحابہ ہوتے تو روایت میں یہ الفاظ نہ ہوتے، کیا بات ہے کہ مہاجرین وانصار کثرت سے روایات بیان نہیں کرتے، بلکہ یہ الفاظ ہوتے: ''ہم ابو ہریرہؓ کی طرح کثرت سے روایت نہیں کرتے'' اس طرح حضرت ابو ہریرہؓ ان سے یوں فرماتے کہ ''تم لوگ تجارت وزراعت میں مشغول رہتے تھے'' یعنی مخاطب کا صیغہ استعمال کرتے غائب کا نہیں۔

میں نے بہت تلاش کیا کہ کوئی ایک بھی صحابی مل جائے جس نے حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت پر اعتراض کیا ہو، مگر ایسا ایک بھی صحابی نظر نہ آیا البتہ میں نے تاریخ میں پایا کہ سب سے پہلے مروان نے یہ اعتراض آپ پر کیا تھا، اور ظاہر ہے کہ مروان تابعی تھا نہ کہ صحابی۔

بہر حال مندرجہ بالا دونوں روایتوں سے کہیں نہیں ثابت ہوتا کہ ناقدین صحابہ میں سے تھے اور ان دونوں روایتوں کے

علاوہ اس مفہوم کی کوئی اور روایت ہے نہیں۔اور اگر ایسا ہوتا تو تاریخ میں اس کا ذکر ضرور ہوتا جیسے بہت سے مسائل میں صحابہ کرام کے علمی مذاکرات کا ذکر ہے، ہم احمد امین اور اس کے مستشرقین اساتذہ کو چیلنج کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایک بھی تاریخی ثبوت پیش کردیں جس سے ثابت ہوسکے کہ ناقدین صحابہ کرام میں سے تھے، بلکہ اس سے کے برعکس تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حضرات صحابہ کرام حضرت ابو ہریرہؓ کی قوت حفظ کے معترف تھے اور یہ تسلیم کرتے تھے کہ ابو ہریرہؓ حدیث کا سب سے زیادہ علم رکھنے والے ہیں۔

۵۔ احناف کبھی کبھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت چھوڑ دیتے ہیں:

احمد امین کہتے ہیں کہ احناف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت کو اگر وہ خلاف قیاس ہوتو قبول نہیں کرتے اور اس کی مثال بیع مصراۃ والی روایت ہے کہ احناف نے خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔

ان کی عبارت سے مندرجہ ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱۔ جب حدیث اور قیاس میں تعارض ہوتو احناف قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

۲۔ احناف نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کے ساتھ خاص طور پر یہ رویہ اپنایا۔

۳۔ احناف حضرت ابو ہریرہؓ کو فقیہ نہیں مانتے۔

ڈاکٹر صاحب کی تینوں باتیں غلط ہیں:

۱۔ یہ بات صحیح نہیں کہ حنفیہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں، بلکہ امام ابوحنیفہؒ صاحبین اور اکثر حنفیہ کی رائے یہ ہے کہ حدیث کو قیاس پر ترجیح حاصل ہوگی، جمہور علماء اسلام کا بھی یہی خیال ہے، البتہ احناف میں سے فخر الاسلام ابن ابان اور ابوزید کی رائے یہ ہے کہ اگر راوی فقیہ ہوتو اس کی روایت قیاس پر مقدم ہوگی، اور اگر وہ غیر فقیہ ہوتب بھی اس کی روایت ہی کو ترجیح ہوگی، الا یہ کہ وہ روایت تمام قیاسات سے ٹکراتی ہو اور قیاس کا دروازہ اس سے بالکل مسدود ہوجاتا ہوتو قیاس کو ایسی روایت پر ترجیح حاصل ہوگی۔اس کی مثال بیع مصراۃ والی حدیث ہے۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ جمہور احناف قیاس کو ہر حدیث پر مقدم رکھتے ہیں خواہ راوی فقیہ ہو یا غیر فقیہ۔

۲۔ دوسری بات جو لوگ حدیث کے مقابلے میں قیاس کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ ایسا صرف حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ تمام راویوں کے ساتھ وہ ایسا کرتے ہیں، اس لیے احمد امین صاحب کا حضرت ابو ہریرہؓ کی تخصیص کرنا سرے سے غلط ہے۔

۳۔ احمد امین صاحب کی یہ بات کہ احناف حضرت ابو ہریرہؓ کو فقیہ نہیں مانتے، غلط ہے، اس لیے کہ یہ خیال احناف میں سے صرف فخر الاسلام ابن ابان اور ابوزید کا ہے، ان کے علاوہ تمام حنفیہ حضرت ابو ہریرہؓ کو فقیہ تسلیم کرتے ہیں۔

جہاں تک بیع المصرّاۃ والی روایت کی بات ہے تو اگر یہ صحیح ہے کہ احناف نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ ایک اصول ہے جو جمہور علماء کے نزدیک مسلم ہے، وہ یہ کہ جب خبر واحد کتاب وسنت اور اجماع سے ٹکراتی ہوتو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔اور مذکورہ حدیث احناف کے نزدیک خبر واحد ہے اور کتاب وسنت کے خلاف ہے، اور اس کے علماء مختلف جواب دیے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ منسوخ ہے کما نقل عن ابی حنیفۃ۔

اور فخر الاسلام وغیرہ کا جو نظریہ پیش کیا گیا، اس کے بارے میں شارح مسلم الثبوت نے بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہے

کہ یہ محض ان کا اوران کے سوا چند فقہاء کا خیال ہے، اس لیے کہ حضرت ابو ہریرہؓ بلا شک وشبہ فقیہ ومجتہد ہیں، وہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اوراس کے بعد بھی فتوی دیا کرتے تھے، مگر تعجب ہے کہ اس کے باوجود احمد امین نے اس نظریہ کو تمام احناف کی طرف منسوب کر دیا، جیسا کہ انھوں نے یہ افترا کیا تھا کہ حنفیہ قیاس کو حدیث پر ترجیح دیتے ہیں۔

اب دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ احمد امین مسلم الثبوت اور شارح کے کلام کو سمجھ نہیں پائے اس لیے فخر الاسلام کے نظریہ کو جملہ احناف کی طرف منسوب کر دیا، مگر احمد امین جیسے ادیب سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

۲۔ انھوں نے یہ کام جان بوجھ کر کیا اور دانستہ یہ افترا پردازیاں کیں۔

٦۔ وضاعین نے حضرت ابو ہریرہؓ کی کثرت روایت سے خوب فائدہ اٹھایا:

یہ اعتراض بھی بے سروپا ہے اس لیے کہ اس میں حضرت ابو ہریرہؓ کی کوئی خصوصیت نہیں بلکہ وضاعین نے یہی سلوک دیگر صحابہ کرام کے ساتھ کیا اور بہت سی حدیثیں وضع کر کے ان کی جانب منسوب کر دیں۔

ہمیں تعجب ہے اس بات پر کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے ترجمہ میں اس بات کو ذکر کرنے کا کیا مقصد کہ بہت سے وضاعین نے لاتعداد حدیثیں گھڑ کر ان کی جانب منسوب کر دیں، اور اگر یہ بات ذکر کرنی ہی تھی تو صرف حضرت ابو ہریرہؓ کا ہی نام کیوں لیا گیا، یہ کام تو دوسرے صحابہ کے نام سے بھی کیا گیا۔

دراصل بات یہ ہے کہ گولڈزیہر نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے اور کہا ہے کہ بعد میں بہت سی احادیث گھڑ کر حضرت ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب کر دی گئیں، اس لیے اب وہ مشکوک ہوگئی ہیں۔ اس لیے احمد امین صاحب کے لیے ضروری تھا کہ اپنے استاد کی پیروی کریں۔

اس رویہ سے آپ احمد امین صاحب کی ذہنیت کا اندازہ کر سکتے ہیں، وہ ہر جگہ حضرت ابو ہریرہؓ کا نام گھسیٹ کر لے آتے ہیں، خواہ اس کا تعلق موضوع سے ہو یا نہ ہو، چنانچہ جب وہ اس بات کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ صحابہ ایک دوسرے پر تنقید کرتے تھے، تو بھی حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت پیش کرتے ہیں، جب وہ ذکر کرتے ہیں کہ محدثین نے متن حدیث کی تنقید نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی ضعیف روایتوں کو بھی صحیح قرار دیا اور اس کی مثال پیش کرتے ہیں تو بھی ان کی روایت پیش کرتے ہیں۔ اور جب اس طرح کہتے ہیں کہ ابو ہریرہ حافظہ سے روایت کرتے تھے گویا حافظے سے روایت کرنے والے وہ تنہا ہوں۔

غرض موقع کیسا بھی ہو اور موضوع کوئی سا بھی ہو وہ حضرت ابو ہریرہؓ کا نام ہی پیش کرتے ہیں، اس سے ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ آپ کی شخصیت کو مشکوک بنا دیا جائے۔

ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ جو صحابی وفات رسول کے ۴۷ سال بعد تک اکابر صحابہ کی موجودگی میں روایت کرتا رہا ہو، صحابہ جس کی تعظیم کرتے رہے ہوں اور جس کے تلامذہ ومنتسبین کی تعداد آٹھ سو تک جا پہنچی ہو، اس کے بارے میں تیرہویں صدی کا ایک شخص آکر کہتا ہے کہ ابو ہریرہؓ ناقابل اعتبار ہیں تو اسے دیوانے کی بڑ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے!!

☆☆☆

❑ عورت اور اسلام

عورت، ہمارا رویہ اور اسلام کی تعلیم

تحریر: علامہ یوسف قرضاوی ترجمہ: محمد شعیب ندوی

نوٹ: یہ مضمون دراصل عبدالحلیم شقہ صاحب کی کتاب ''المرأۃ فی عصر الرسالۃ'' پر علامہ یوسف القرضاوی دامت برکاتہم کا مقدمہ ہے۔ بعض مندرجات سے کسی کو اختلاف ہوسکتا ہے، مگر مضمون بہت شاندار ہے۔ افادے کی غرض سے ترجمہ کے بعد اسے شامل اشاعت کیا جارہا ہے۔ ادارہ

عورت نصف انسانیت ہے، مرد معاشرہ کا ایک حصہ ہے تو عورت اس معاشرہ کا دوسرا حصہ ہے بلکہ عورت کی افادیت اپنے شوہر اور اپنی اولاد کی اثر اندازی میں نصف سے بھی زیادہ ہے اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک شاعر کہتا ہے کہ

الام مدرسة اذا اعددتها
اعددت شعبا طيب الاعراق

ماں ایک مدرسہ ہے اگر آپ اس کو تیار کرتے ہیں تو گویا آپ نے ایسی قوم کو تیار کیا جو اچھی نسل والی ہے، باکمال شخصیات کی تربیت میں عورت کا بڑا کردار ہے چنانچہ حکماء اور دانشوران کہتے ہیں کہ ''ہر کامل ومکمل انسان کے پس پردہ عورت ہے''

ایک طرف مذکورہ بالا افکار ونظریات ہیں جو عورت کے وجود اور اس کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں تو دوسری طرف فلاسفہ کے تصورات ونظریات ہیں جو عورت کے وجود کو سراپا موجب شر اور دنیا میں ہونے والے تمام فتنہ وآزمائش اور جرائم کا سبب قرار دیتے ہیں، ایک فلسفی نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جب بھی کوئی مصیبت یا جرم کا ارتکاب کیا جائے ''تو فوراً عورت کی تحقیق کرو'' بہرحال فلاسفہ قدیم وجدید کی دو جماعت ہیں ایک گروہ عورت کا حامی ومددگار اور اس کے متعلق حسن ظن رکھتا ہے تو دوسرا گروہ اس کا مخالف ہے اس کے وجود کو موجب عار اور اس کو صرف لطف اندوزی کا سامان سمجھتا ہے۔

عورت کے متعلق فلاسفہ کے تصورات:

بعض فلاسفہ عورت کی تعریف وتوصیف خاندان ومعاشرہ میں اس کے کارناموں کو اجاگر کرتے اور اس کے فضائل و احسانات کا اعتراف کرتے ہیں تو بعض اس کے وجود کو معاشرہ کے لئے سم قاتل اور دنیا میں اس کی ذات کو برائی وفساد کی جڑ قرار دیتے ہیں اور اس کو تمام انسانی حقوق ومراعات سے محروم رکھتے ہیں۔ اگر کوئی عورت معلم ومتعلم کے فرائض انجام دیتی ہے تو کہتے ہیں کہ ''کیا سانپ کو ہی زہر پلایا جارہا ہے'' (۱) اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ انسانیت جن جرائم ومصائب سے دوچار ہورہی ہے اور قیامت تک جن مشکلات کا سامنا کرے گی اس کا ذمہ دار اور قصوروار یہ فلاسفہ عورت کو ہی قرار دیتے ہیں۔ ان افکار ونظریات کی تائید وتوثیق یہود ونصاری کی مذہبی کتابوں سے بھی ہوتی ہے، ان کی مذہبی کتابیں اس طرح کے تصورات سے پر ہیں جن میں عورت کی ذات کو تمام خرابیوں کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔

عورت اور اسلام:

دنیا کی مختلف اقوام میں اخلاقی نظریات، قانونی حقوق اور

معاشرتی برتاؤ ہر اعتبار سے عورت کو پست ترین مخلوق سمجھا گیا، چنانچہ جب اسلام آیا تو اس نے عورت کے مقام ومرتبہ کو بلند کیا، اس کے معاشرتی وسماجی اور تہذیبی وتمدنی حقوق واختیارات اور فرائض مقرر کئے ،اس کو بیٹی ، بیوی اور ماں کی شکل میں معاشرہ کا حصہ ہی نہیں بنایا بلکہ ان سب سے پہلے اس کو انسان کے روپ میں پیش کیا اور اس کو عزت وشرافت کے اعلی مقام پر فائز کیا، مرد کی طرح اللہ کے تمام اوامر ونواہی ،ثواب وعقاب کا مخاطب ٹہرایا اور سب سے پہلے حکم الٰہی میں مرد وعورت دونوں کو مخاطب کیا گیا ،وَكُلاَ مِنْهَا رَغَداً حَيْثُ شِئْتُمَا وَلاَ تَقْرَبَا هَـذِه الشجرة فتكو نامن الظالمين (البقرۃ:۳۵) ''اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ،مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا، ورنہ ظالموں میں شمار ہوگے''۔

توریت اور دیگر مذاہب میں عورت کو گناہ کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے اور انسان کو جنت سے نکلوانے کا مجرم ٹھرایا ہے مگر اسلام نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خود مرد کو اس کا ذمہ دار ٹھرایا ہے۔ارشاد ربانی ہے۔(وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَى آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْماً(طہ:۱۱۵) ''ہم نے اس سے پہلے آدم علیہ السلام کو ایک حکم دیا تھا،مگر وہ بھول گئے اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا'' اسی کے ساتھ مرد اور عورت دونوں کو ایک دوسرے کا جز قرار دیا، اسلام کی نظر میں دونوں ایک دوسرے کے یکساں محتاج ہیں نہ عورت مرد سے مستغنی ہوسکتی ہے اور نہ ہی مرد عورت سے بے نیاز ہوسکتا ہے ۔ارشاد باری ہے۔ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (آل عمران :۱۹۵) ''تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو'' و يقول الرسول ﷺ :''انما النساء شقائق الرجال ''(۲) اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عورتیں مردوں کے ہم مرتبہ ہیں''۔

اسلام میں عورت کی حق تلفی،ظلم وجبر اور اس پر مرد کی دست درازی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اسلام دستور الٰہی ہے اور اس میں مرد وعورت دونوں کی فطرت کا مکمل پاس ولحاظ رکھا گیا ہے۔لیکن افسوس صد افسوس مسلمانوں کی ایک جماعت عورت کے متعلق منفی تصورات ونظریات کی حامل ہے جس کے نتیجہ میں عورت کے ساتھ ان کا منفی برتاؤ اور بدسلوکی عام ہے انھوں نے حدود اللہ سے تجاوز کر کے خود اپنے اوپر اور عورت پر بھی ظلم کیا ہے ،مسلمانوں کے دور زوال وانحطاط میں عورت کے ساتھ اس رویہ اور بدسلوکی کا سبب اسلام کی تعلیمات وہدایات اور اسلاف کے طرز اور منہج سے ناواقفیت ہے،آج کے دور میں بھی ہماری فکر کا یہ بہت بڑا المیہ ہے جس کے بارے میں ارباب فکر ونظر شکوہ کناں ہیں کہ مسلمان اپنے مسائل واحکام میں اسلام کے صحیح اور معتدل موقف سے واقف نہیں ہیں حالانکہ اسلام نام ہی جادۂ مستقیم کا ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اسلامی تعلیمات میں افراط وتفریط کے شکار ہو جاتے ہیں کہیں غلو ہے تو کہیں تقصیر ہے صحیح اور معتدل موقف ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے ،اسلام میں اعتدال و وسطیت کی بہت اہمیت ہے اور ہم کو امت وسط بنایا گیا ہے ارشاد باری ہے۔ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطاً (البقرۃ :۱۴۳) ''اور اسی طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک ''امت وسط بنایا ہے'' ایک حکیمانہ قول بھی بہت عام اور متداول ہے کہ خير الامور اوسطها معتدل چیز سب سے بہترین ہوا کرتی ہے '' حضرت علیؓ کا مقولہ ہے کہ عليكم بانمط الاوسط ، يرجع اليه الغالي ،و يلحق به التالي(۳) ،معتدل اور میانہ روی اختیار کرو،غلو کرنے والا تمہاری طرف لوٹ کر آئے گا اور کوتاہ نظر بھی تم سے ملے گا''۔

موجودہ اسلامی معاشرہ اور عورت:

موجودہ اسلامی معاشرہ عورت کے متعلق افراط وتفریط کا شکار ہے ایک طرف غلو ہے تو دوسری طرف تنگ خیالی ہے،تنگ خیال اور کوتاہ بیں اشخاص عورت کو ذلت وحقارت سے دیکھتے ہیں، ان کے نزدیک عورت تمام خرافات کی جڑ ہے ،ضلالت و گمراہی کا منبع ہے،اس کا دین اور عقل ناقص ہے، وہ صرف لطف اندوزی اور لذت کے حصول کا سامان ہے،عورت مرد کی باندی

اور اس کی خادمہ ہے، مرد جب چاہے اس کو مال دے کر شادی کر کے اپنی خواہشات پوری کرے اور جب چاہے اس کو طلاق دے دے، عورت کو نہ تو اپنے دفاع کا حق اور نہ ہی وراثت کی مستحق ہے بلکہ بعض لوگوں نے تو اس کو جوتے کے مانند خیال کرلیا ہے کہ جب چاہو پہنو اور جب چاہو اتار پھینکو۔

رفیق حیات کے انتخاب کا حق او ر وراثت سے محرومی : ان تنگ خیال لوگوں نے عورت کو شریک حیات کے انتخاب کے حق سے بھی محروم کردیا ہے اگر عورت کسی مرد سے شادی کرلے اور وہ اس کو ناپسند ہو تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، وہ گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہو جاتی ہے یہاں تک کہ مرد ہی طلاق پر راضی ہو جائے ورنہ عورت کے پاس مرد سے خلاصی اور نجات پانے کا کوئی راستہ اور تدبیر نہیں ہے اس کو تمام اختیارات سے محروم کردیا گیا ہے ستم بالائے ستم بعض لوگوں نے تو عورت کو عہد جاہلیت کی طرح وراثت سے بھی محروم کردیا ہے اور اپنی تمام جائداد اور ترکہ اپنی زندگی میں ہی اپنی نرینہ اولاد کے لئے نامزد کر جاتے ہیں، اور عورتوں کو اس میں ذرہ برابر بھی حقدار نہیں سمجھتے ہیں۔

عورت پر بے جا قیود :

آج لوگوں نے عورت کو گھروں میں قید کردیا ہے، اس پر قید و بند کی اتنی صعوبتیں ڈال دی ہیں کہ وہ شرعی امور اور معاشرہ کی ترقی و فلاح کے لئے کسی بھی جائز سرگرمی میں حصہ نہیں لے سکتی ہے حد تو یہ ہوگئی ہے کہ عورت کی صالحیت کا معیار ہی یہ قرار دے دیا گیا ہے کہ شریف و معزز عورت گھر سے دو ہی مرتبہ نکلتی ہے ایک اپنے والد کے گھر سے اپنے شوہر کے گھر تک اور دوسری مرتبہ اپنے شوہر کے گھر سے اپنی آخری قیام گاہ قبر تک، حالانکہ اسلام نے زنا کی معروف سزا کی تعین سے پہلے اسی عورت کو گھر کی چہار دیواری میں قید کرنے کا حکم صادر کیا ہے جس نے زنا کا ارتکاب کرلیا ہو اور اس کا یہ جرم چار گواہوں کے ذریعہ ثابت ہوگیا ہو

وَاللاَّتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُواْ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُواْ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىَ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّهُ لَهُنَّ سَبِيلاً (النساء :۱۵) ''تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو، اور اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ انھیں موت آجائے، یا اللہ ان کے لئے کوئی راستہ نکال دے''۔

اس کو علم کے حصول اور دین کی افہام و تفہیم سے محروم کردیا ہے اور اس کی ذمہ داری اس کے والد اور شوہر پر ڈالی ہے کہ وہ عورت کو علم کی دولت سے سرفراز کرے، نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ دونوں اس کو کچھ نہیں سکھا پاتے ہیں کیونکہ وہ خود حصول علم کے محتاج ہوتے ہیں اور ہمیشہ ظلمت و تاریکی عورت کا مقدر بن جاتی ہے، اسلام نے علم کے حصول کی بہت زیادہ تاکید کی ہے کہ طلب العلم فريضة على كل مسلم و مسلمة(ابن ماجه: ح، ٢٢٤) علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر ضروری ہے اور امہات المؤمنین عہد صحابہ کی خواتین اور اسلاف کی بیویاں صاحب علم و فضل تھیں، علم قرآن وحدیث، فقہ شعر و ادب اور فنون لطیفہ کی ماہر تھیں، بعض علماء نے تو خواتین سے روایت بھی کی ہے جیسا کہ حدثنی كريمة بنت المروزية کی روایت کا بخاری میں تذکرہ ملتا ہے، ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود بھی لوگوں نے عورت کو علم کے حصول سے محروم رکھا۔

اس سے ایک قدم اور بڑھ کر عورت کو نماز اور پند و موعظت کے لئے مساجد میں جانے سے بھی روک دیا گیا ہے ، عہد نبوی میں عورتیں باجماعت نماز پڑھتی تھیں یہاں تک کہ فجر و عشاء تک میں حاضر ہوتی تھیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے صراحت کے ساتھ یہ اعلان کردیا تھا کہ لا تمنعوا اماء الله مساجد الله(٤) اللہ کی بندیوں کو اللہ کی مساجد میں آنے سے مت روکو۔

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب

کے ماننے والے خواہ وہ یہودی ہوں یا مسیحی، مجوسی، بودھسٹ ہوں یا ہندومت کے ماننے والے، ان کی خواتین اپنے اپنے مذہبی مقامات اورعبادت خانوں میں بے خوف وخطر جاتی ہیں لیکن اسلام کا جوامتیازی وصف تھا کہ اسی نے سب سے پہلے اس چیز کی اجازت دی تھی آج مسلمان عورت مسجد جانے سے بھی محروم ہے اس کو بازار کی زینت بنانے میں تو کوئی فتنہ وفساد کا خدشہ نہیں ہوتا ہے صرف مسجد میں عورت کے آنے سے اس بات کا اندیشہ کیا جاتا ہے۔اسی کے ساتھ بعض صحابیات مثال کے طور پر حضرت اسماءؓ کا اپنے شوہر حضرت زبیرؓ کے ساتھ مشارکت اور قرآن میں صراحت کے ساتھ حضرت شعیب علیہ السلام کی دو صاحبزادیوں کا حضرت موسی علیہ السلام کو اجرت پر رکھنے کا واقعہ مذکور ہے جو عورتوں کی جائز امور میں شرکت پر واضح دلیل ہے قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِينُ (القصص:۲۶)''ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا''اباجان،اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے ،بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہوسکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو''لیکن ان تمام آثار کو نظر انداز کر کے مسلم خاتون کے باپ اور شوہر وغیرہ کے ساتھ شرعی امور میں شرکت کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے،اور اس کو اس حق مشارکت سے مکمل طور سے محروم کر دیا گیا ہے۔

نصوص سے غلط استدلال :

موجودہ اسلامی معاشرہ نے عورت پر ان بے جا قیود اور گھر میں قید کرنے ،رفیق حیات کے انتخاب کے حق سے محرومی اور دیگر حقوق کی پامالی کے لئے مبہم نصوص وہدایات سے استدلال کیا ہے اور محکم وواضح احکام کو نظر انداز کر دیا ہے صحیح احادیث کی غلط تشریح وتوضیح اور سیاق سے ہٹا کر اپنا مفہوم نکالا ہے۔اسی کے ساتھ بعض علماء مالکی ،شوافع ، جمہور حنابلہ نے بھی عورت کے شریک حیات کے انتخاب کے سلسلہ میں ایسے دلائل کو اختیار کیا ہے جو اصول وقواعد پر پرکھنے کے بعد کمزور ثابت ہوتے ہیں ۔امام ابن تیمیہؒ اور ابن قیم نے ان کی اس رائے سے نا اتفاقی ظاہر کی ہے عورت کے حق میں اس طرح کا اقدام نہایت ہی افسوس کی بات ہے، چنانچہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں قید کرنے کے لئے اس خاص آیت سے استنباط کیا ہے جو امہات المؤمنین کی شان میں نازل ہوئی تھی يَا نِسَاء النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ النِّسَاء إِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ قَوْلاً مَّعْرُوفاً (32)وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (الاحزاب۳۲:۳۳،)''نبی ﷺ کی بیویو،تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔اپنے گھروں میں ٹک کر رہو'' (الاحزاب:۵۳،)

عورت کے مقام ومرتبہ کو فروتر کرنے اور اس کے حقوق کو غصب کرنے کے لئے اس حدیث سے غلط استنباط کیا گیا ہے جس میں عورت کی عقل ودین کو ناقص قرار دیا گیا ہے(۵)(اس پر تفصیلی گفتگو آگے آرہی ہے)اسی طرح اپنے نظریہ کی تائید میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں لو امرت احدا ان یسجد لاحد لامرت المراۃ ان تسجد لزوجھا ''(۶)اگر میں کسی کو کسی کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

ضعیف و موضوع روایات سے استدلال:

ان تنگ خیال لوگوں نے عورت کے متعلق اپنے متشددانہ موقف کو اختیار کرنے میں صحیح احادیث کی غلط تشریح تو کی ہی لیکن ستم بالائے ستم ضعیف وموضوع احادیث سے استنباط کیا اور کبھی ضرورت پڑنے پر حدیث گڑھ بھی لی۔نمونہ کے طور پر مندرجہ ذیل احادیث کا مشاہدہ کیجئے۔

سال رسول اللہ ﷺ لابنتہ فاطمہ الزھراء : ای شئی

اصلح للمرائة ؟فقالت :الا تری رجلا و لا یراها رجل ،فقبلها ثم قال :ذریة بعضها من بعض "(۷)

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی بیٹی فاطمہؓ سے دریافت کیا کہ عورت کے لئے سب سے بہتر چیز کیا ہے؟ حضرت فاطمہؓ نے جواب دیا کہ وہ نہ کسی مرد کو دیکھے اور نہ اسے کوئی مرد دیکھے، آپ ﷺ نے ان کا بوسہ لینے کے بعد فرمایا ذریة بعضها من بعض "یہ حدیث نہایت ہی ضعیف ہے دوسری حدیث ''شاوروهن و خالفوهن (۸)' 'عورتوں سے مشورہ کرو اور ان کی مخالفت کرو' یہ بھی ضعیف و موضوع ہے اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ یہ قرآن وسنت کے مخالف ہے کیونکہ قرآن میں بچہ کے دودھ کو ماں باپ کی باہمی رضامندی اور باہمی مشورہ کے بعد چھوڑنے کا حکم دیا گیا ہے ارشاد باری ہے فَإِنْ أَرَادَا فِصَالاً عَن تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (البقرۃ:۲۳۳) ''اگر فریقین باہمی رضامندی اور مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں، تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں''، صلح حدیبیہ کے موقع پر حضور ﷺ نے اپنی زوجہ ام سلمہؓ سے مشورہ کیا تھا کہ لوگ حلق نہیں کرا رہے ہیں کیا کرنا چاہیے انھوں نے آپ ﷺ کو ہی سب سے پہلے حلق کرانے کا مشورہ دیا تھا آپ ﷺ نے اس پر عمل بھی کیا، اسی طرح یہ لوگ حضرت کے قول سے دلیل لیتے ہیں: عن علیؓ قال :المراة شر کلها ، و شر ما فیها انه لابد منها "(۹) کہ عورت سراپا شر ہے اور اس کی ہر چیز شر ہے'' اس قول کا بطلان میں نے اپنی کتاب (فتاوی معاصرہ) میں کیا ہے۔ ایک اور روایت سے بس وہ استدلال کرتے ہیں، جو حاکم نے اپنی مستدرک میں بیان کی ہے کہ لا تسکنوهن الغرف، و لاتعلموهن الکتابة ''(۱۰) عورتوں کو کمروں میں قیام مت کرنے دو اور نہ ہی ان کو لکھنے کی تعلیم دو'' احادیث کے ناقدین نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے۔

عورت کے ساتھ ناانصافی کرنے اور اس پر جکڑ بندیوں پر جکڑ بندیاں لگانے میں ادب وشاعری کی کتابوں کو اسلامی مصدر کے طور پر اختیار کیا گیا ہے چنانچہ راغب اصفھانی کی محاضرات الادباء میں ایک فصل قائم کی گئی ہے جس کا عنوان فائدة موتها و تمنیه ''لڑکی کی موت اور موت کی تمنا کا فائدہ'' ہے اس میں دو حدیث نقل کی گئی ہے۔

(۱) قال رسول ﷺ :نعم الختن القبر ''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سب سے بہتر داماد قبر ہے (۲) و قال :دفن البنات من المکرمات '(۱۱) اس میں فرمایا کہ لڑکیوں کا دفن کرنا معزز و مکرم اعمال میں سے ہے۔ یہ دونوں حدیثیں موضوع اور گھڑی ہوئی ہے، ان جیسی احادیث سے رسول اللہ ﷺ اور اسلام کی شبیہ خراب ہوتی ہے۔

ایک غلط فہمی کا زالہ :

شعر وشاعری اور ادب کی کتابیں اسلامی شریعت کا مصدر و ماخذ نہیں بن سکتیں، لوگوں کو مراجع اور ماخذ کی درجہ بندی اور ان کا معیار معلوم ہونا چاہیے، ہر کتاب کی بات کو صحیح تسلیم نہیں کرنا چاہیے، یہ ضروری نہیں کہ مصنف علم وفن کی دنیا میں شہرت یافتہ ہو تو اس کی ہر بات قابل قبول ہوگی بلکہ ہر مصنف کا ایک خاص فن ہوتا ہے جس میں وہ ماہر ہوتا ہے اس کے علاوہ دیگر فنون میں اس کی حیثیت ایک عام شخص کی سی ہوتی ہے، ان میں اس کی رائے قابل قبول نہیں ہوتی اور اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے ،لہذا راغب اصفہانی ایک مشہور مصنف ہیں ،آپ کی تصانیف مفردات القرآن اور الذریة الی مکارم الشریعة مشہور ہیں لیکن یہی مقام ومرتبہ ان کی ادبی کتابوں کو نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی ان سے کوئی شرعی حکم بیان کیا جاسکتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیئے امام غزالیؒ کی المنقذ من الضلال ملاحظہ فرمائیں۔(۱۲)

پارسائی میں غلو و شدت:

موجودہ اسلامی معاشرہ میں غلو اور شدت پسندی کی انتہا ہو گئی ہے ،اس پر پارسائی کا اتنا رنگ چڑھ گیا ہے کہ وہ اپنی

پرہیزگاری میں حدود اللہ سے بھی تجاوز کر گیا ہے، اس نے عورت کی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے اس پر اتنی سختی اختیار کی ہے کہ اس کو جائز حقوق سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اس کا گھر سے نکلنا، مسجد جانا، ادب واحترام کے ساتھ مردوں سے کلام کرنا سب حرام ہے، جس چیز کو شریعت نے ستر قرار نہیں دیا اس کو آج کے نام نہاد پرہیزگاروں نے ستر قرار دیا ہے چناں چہ عورت کا چہرہ، ہتھیلی ،آواز، اس کا کلام کرنا، یہ تمام چیزیں ان کے نزدیک ستر ہے۔ یہاں تک کہ حج وعمرہ کے موقع پر، مصر اور کئی ملکوں میں پہنے جانے والے سفید لباس پر بھی ان کو اعتراض ہے عورتوں کے لیئے وہ شدت پسند لوگ اس کو ناپسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں اس لباس میں مردوں کی مشابہت ہوتی ہے۔ ان کو معلوم نہیں کہ اسلام میں عورت کی زیب وزینت کا مرد سے زیادہ خیال کیا گیا ہے، عورت کو ان چیزوں کی اجازت دی گئی ہے جن سے مرد محروم ہے عورت کے لئے جواہر وزیورات، ریشم کا لباس جائز قرار دیا گیا ہے اور مرد کو ان تمام چیزوں سے محروم رکھا ہے۔

غلو پسندی:

ایک طرف ان شدت پسند اور انتہا پسند لوگوں کی جماعت ہے جنہوں نے عورت کی حق تلفی کی، اس پر ظلم وجور کے پہاڑ توڑے ہیں اس کے عرصہء حیات کو تنگ کر کے رکھ دیا ہے تو دوسری طرف ان لوگوں کا گروہ ہے جو افراط کا شکار ہیں، انہوں نے عورت پر اتنی مہربانیاں کیں کہ اس کو شرعی حدود کا بھی خیال نہیں رہا، عورت کے مقام ومرتبہ کو اتنا بلند اور آزاد خیالی کا اتنا ثبوت دیا کہ حدود اللہ سے تجاوز اور فطرت سے بغاوت کر دی۔ پہلا گروہ اگر مشرقی رسوم ورواج کا خوگر ہو چکا ہے تو دوسرا مغربی تہذیب وثقافت اور آزاد خیالی کا دلدادہ ہے۔

مفرطین کے تصورات:

دوسری جماعت کے لوگ مرد وعورت کے تمام فطری امتیازات کو مٹانا چاہتے ہیں، ان کے نزدیک جس طرح مرد انسان ہے اسی طرح عورت بھی ایک انسان ہے، دونوں ایک دوسرے کے لیے پیدا کئے گئے ہیں، دونوں میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ لوگ اس بات کو بھول رہے ہیں کہ اللہ نے دونوں کے درمیان فرق رکھا ہے، فطری طور پر جسمانی اعتبار سے دونوں کی ساخت ومزاج الگ الگ ہے

ایک حدیث کے تحت دونوں کے اوصاف وصلاحیتیں اور فرائض و واجبات جداگانہ ہیں عورت کی ممتا کے پیش نظر ہی اس پر گھر کے اندر کے کاموں کی انجام دہی رکھی ہے۔ جب فطری طور پر دونوں میں فرق ہے تو اس فرق کو عورتوں کی تعلیم وتربیت اور فرائض کی تقسیم میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔

احادیث صحیحہ کا انکار:

بعض لوگ ان احادیث کا بے دریغ انکار کر دیتے ہیں جو ان کی عقل میں نہیں آتیں، اس کی مثال ایک عالی مرتبت ادیبہ ہے ان ادیبہ صاحبہ نے قطر میں لکچر دیتے ہوئے امت میں متداول ورائج حدیث لن یفلح قوم ولوا امرھم امرائة(۱۳) کا مکمل طور سے انکار کر دیا ہے، اسی طرح ایک قانون کے استاد نے اپنی کتاب میں یہ تحریر کیا ہے کہ خبر آحاد سے کوئی بھی حکم شرعی نہیں ثابت کیا جاسکتا شرعی قانون سازی کے لیے حدیث کا متواتر یا کم از کم مشہور ہونا ضروری ہے، یہ ایسی شرط ہے کہ امت میں چودہ سو سال سے کسی فقیہہ ومحدث نے اس طرح کی شرط نہیں لگائی ہے، اس سے بھی تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ ایک صاحب نے اپنی تحریر میں اس حدیث لن یفلح قوم ولوا امرھم امرائة کو اس بنا پر جھوٹی اور غلط قرار دے دیا کہ ان کے خیال کے مطابق اس صحیح حدیث خذوا نصف دینکم عن ھذہ الحمیراء(۱٤) کی مخالفت ہوتی ہے، دیکھئے کس طرح ایک غلط اور گھڑی ہوئی حدیث کی بنا پر امت میں متداول ومقبول حدیث کا رد کر دیا گیا ہے۔

شریعت سے بغاوت:

اسلام دین فطرت ہے، اس کے قوانین وقواعد انسان کی فطری

ضرورتوں کوملحوظ رکھتے ہوئے بنائے گئے ہیں،بعض اصول ہماری عقل کے ادراک میں آسکتے ہیں بعض نہیں آتے ہیں ،بعض لوگ اپنی آزادخیالی کا اتنا ثبوت دیتے ہیں کہ وہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کوحرام اوراس کی حرام کردہ اشیاءکوحلال قرار دیتے ہیں اوراسلام کی بوقت ضرورت دی گئی اجازتوں کوحرام ٹھہراتے ہیں اسلام نے تعدد ازواج کی کچھ شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے وہ ایک سے زائد شادی کرنے کوحرام اورعورت کے وراثت میں مرد کے برابر حصہ کا قائل ہیں ،اس طرح وہ قرآن وسنت اورعمل صحابہ وعلماء امت کی مخالفت کرتے ہیں،شریعت کے اصول وضوابط سے بغاوت کرتے ہیں۔اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض نام نہادعلماء جوصحافت اور ذرائع ابلاغ سے منسلک ہیں وہ اللہ کی جانب بے سروپا باتیں منسوب کرتے ہیں اوراپنی کم علمی یاتجاہل عارفانہ برتتے ہوئے اورحکمراں طبقہ کے خیالات ورجحانات کا جوازفراہم کرنے اوران کی جانب سے تحسین آفریں کلمات حاصل کرنے کے لئے صحیح احادیث کا انکار،حلال کوحرام اورحرام کوحلال کا فتوی صادر کرتے ہیں،اسلام مخالف سرگرمیوں (قانون زنا کی اجازت اورتعدداز واج کی حرمت) سے سکوت اختیار کرتے ہیں۔عورت کوزیب وزینت کے لئے مصنوعی بال لگانے کا فتوی دیتے ہیں اوراتنا تنگ لباس جس میں بازواور پنڈلیاں اور بال کھلے ہوں پہننے کا جوازفراہم کرتے ہوئے اس کوگناہ صغیرہ قرار دیتے ہیں جس کی تلافی نماز پڑھنے سے ہوجاتی ہے۔کس قدر جہالت آمیزفتوی ہے،ان کو معلوم نہیں کہ حدیث متواتر کے ذریعہ ایسی عورتوں کوجہنمی اوران پر لعنت وملامت اوراس فعل کو یہودی افعال میں سے شمار کیا گیا ہے اللہ کے رسول ﷺ نے ارشادفرمایالعن اللہ الواصلة والمستوصلة ،(۱۵)دوسری جگہ ارشاد ہے ان النبی ﷺ جعل من اهل النا ر النساء (الكاسيات العاريات)انهن لا يدخلن الجنة و لا يجدن ريحها ،وان ريحها ليو جد من مسيرة كذا و كذا(١٦)۔

اگر ان کے لباس برہنگی کو گناہ صغیرہ کا درجہ دے بھی دیا جائے توان مفتیان کومعلوم ہونا چاہیے کہ صغیرہ گناہ اصراراورتکرار کے بعد گناہ کبیرہ شمار کیا جانے لگتا ہےاورعلماءاسلام کا متفقہ اصول ہے کہ صغیرہ گناہ اصرار کے نتیجہ میں کبیرہ اور کبیرہ گناہ استغفار کرنے سے معاف ہوجاتا ہے۔

مغرب زدہ لوگوں کا رویہ :

صحیح بات تو یہ ہے کہ مغربی لوگوں کی افراط مشرقی لوگوں کی تفریط کا ردعمل ہے۔فطری اصول ہے کہ ''انتہا پسندی اورتشدد کے ردعمل میں انتہا پسندی اورتشدد ہی جنم لیتا ہے'' بہرحال اللہ نے ہم کوقرآن وسنت اور جادہ ءمستقیم کا مکلّف بنایا ہے نہ کہ مغرب ومشرق اورقدیم وجدید کا پابند بنایا ہے،اسلام نے معتدل موقف اختیار کرنے کا حکم دیا ہے نہ کہ افراط وتفریط اورغلواورانتہا پسندی کی ترغیب دی ہےارشاد باری ہے أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ (الرحمٰن :۹)''تم میزان میں خلل نہ ڈالو،انصاف کے ساتھ ٹھیک ٹھیک تولواورترازو میں ڈنڈی نہ مارو''۔

اسلامی معاشرہ اور خانگی معاملات میں عورت کے کردار کا مسئلہ ہمیشہ افراط وتفریط کا شکار ہوا ہے۔اس کے ذریعہ حق و باطل خیروشر کے امتیاز میں دشواری آئی ہے،امت مسلمہ معتدل اوراسلام کی حقیقی تعلیمات سے ناواقف رہی ہے،اسلام کے صحیح اورمعتدل موقف کومصنف عبدالحلیم ابوشقہ نے اپنی سالہا سال کی کاوشوں،عرق ریزی اورپیہم جدوجہد کے بعد بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے،خانگی اورسماجی زندگی میں خواتین کی ذمہ داریوں کے متعلق اسلام کا وسیع اور ہمہ گیرتصور بیان کیا ہے،ابوشقہ نے خاتون مسلم کا مقام ومرتبہ،لباس وزینت وآرائش کے حدود ،خاندان اور معاشرہ میں عورت کا کردار،مردوں سے ملاقات کااسلامی طور وطریقہ ، اجتماعی و سیاسی زندگی میں عورت کی مشارکت قرآن واحادیث اورعلماء امت کے موقف کی روشنی

میں پیش کی ہے، مصنف کی کاوش مسلمان عورت کے متعلق ایک انسائیکلو پیڈیا ہے جس میں مسلم خاتون کی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرلیا گیا ہے۔

کتاب کی وجہ تالیف :

مصنف نے جب دیکھا کہ عورت کے متعلق بعض نام نہاد مسلم داعیوں اور اسلامی جماعتوں نے تنگ نظری اور محدود تصور اختیار کر رکھا ہے اس کے ساتھ متشددانہ سلوک برت رہی ہیں ،جس کی وجہ سے مسلم خواتین اور مسلم نوجوان اسلام سے برگشتہ اور بیزاری ظاہر کرنے لگے ہیں، اسلام کی شبیہ خراب کرنے کا سبب بن رہے ہیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سیکولر اور بددین لوگوں کو مواقع فراہم کر رہے ہیں تو اس تشویشناک صورت حال میں مصنف نے عورت کے متعلق اسلام کا صحیح نظریہ وموقف پیش کیا اور مسائل ومشکلات کا اسلامی حل قرآن وسنت کی روشنی میں مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔

مصنف کا اجمالی تعارف :

مصنف کا نام عبد الحلیم شقہ کنیت ابوعبد الرحمٰن ہے مصنف اسلامی اسکالر ،باکمال محقق ،مفکر ،سنجیدگی و متانت کے پیکر اوصاف حمیدہ کے خوگر، خوش اخلاق وخوش مزاج، متواضع و برد بار، ناقد وحق گو، دیندار وحق کے متلاشی، مومنانہ قلب، مصلحانہ جذبہ کے ساتھ نبض شناش ،اور محبوب نظر تھے ،قرآن وسنت اور اسلامی تعلیمات واحکامات پر عمل پیرا تھے، آپ گمنام شخصیت کے مالک، باصلاحیت، تجربہ کار اور تحقیق پسند مربی اور مصلح تھے، جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا، ہمیشہ شریعت کے آسان پہلوؤں کو اختیار کرنے والے تھے، دوحہ کے سکنڈری اسکول کے منتظم تھے، میں نے (یوسف قرضاوی) اور مصنف نے وزارت تعلیم وتربیت قطر میں ایک ساتھ کام کیا، آغاز شباب ہی سے تحریک اخوان المسلمون کے سرگرم رکن تھے، بانیٔ تحریک امام شہید حسن البناء کے قریبی تھے، تحریک سے وابستگی کی وجہ سے آپ پس زنداں بھی ڈالے گئے، رسالہ المسلم المعاصر کے ذریعہ اسلام کے بارے میں عقلی واخلاقی بحران کا قلع قمع کرنے والے تھے۔

عالم اسلام کا عورت کے متعلق تشدد وانتہا پسندی کا رویہ، اس سے بدگمانی کا موقف صدیوں سے چلا آرہا تھا اسی کے پیش نظر مصنف نے مسلم عورت سے بے جا سختیوں و جکڑ بندیوں کے خاتمہ اور مسلمان عورت کے لئے آسانی وسہولت کا صحیح واسلامی موقف پیش کیا ہے۔

متشددانہ موقف کے دو اسباب :

(۱) موجودہ اسلامی معاشرہ کا عورت کے متعلق اس شدت آمیز رجحان رکھنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی اکثریت سہولت وآسانی پر مبنی شرعی نصوص سے ناواقف ہے، خاص طور سے صحیح احادیث سے ناآشنائی ہے کیوں کہ احادیث کتابوں کی شکل میں مدون کی گئی ہے تمام کتابوں پر نظر رکھنا دشوار ہے نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ فقہاء کے مذاہب و مسالک اور ضعیف وموضوع روایات میں منہمک ہوگئے اور صحیح احادیث کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے عورت کے متعلق درست ہدایات ان کو معلوم نہ ہو سکیں اور انہوں نے اسی موقف کو اختیار کیا۔

(۲) دوسری وجہ یہ کہ لوگوں کو جن احادیث کا علم تھا ان کا انہوں نے غلط مفہوم سمجھا اور دور از کار کی تاویلات کیں، سیاق وسباق اور شان نزول کو نظر انداز کر کے احادیث کا غلط معنی ومفہوم متعین کیا ،ناسخ ومنسوخ، احادیث کے ظاہری وباہمی تعارض سے ناواقف رہے، مقاصد شریعت سے لاعلمی کی وجہ سے صحیح معلومات تک ان کو رسائی نہ ہوسکی۔

مصنف نے ان دونوں اسباب کے پیش نظر درج ذیل دو پہلوؤں پر اپنی بھرپور توجہ مرکوز کی ہے۔

(۱) مسلم خاتون کے موقف اور کردار سے متعلق صحیح ومستند شرعی نصوص ودلائل کو جمع وترتیب دینا جن سے اسلام کی روح کی ترجمانی ہو اور عورت کا کھویا ہوا مقام ومرتبہ بحال ہوجائے۔ ایسی

احادیث اپنے واضح مفہوم ومعنی کے لحاظ سے بیشمار ہیں، تمام کا احاطہ کرنا ناممکن ہے قرآن واحادیث میں مسلمان عورت کے پیش کردہ مقام ومرتبہ، ذمہ داریوں کا کچھ اندازہ مصنف کی کتاب کے مندرجہ ذیل عناوین سے کیا جاسکتا ہے۔

خواتین کا معلم انسانیت سے مردوں سے الگ تعلیمی درسگاہ کے قیام کا مطالبہ

مسجد کے عمومی اجتماعوں میں خواتین کی شرکت

ام المؤمنین حضرت زینب بنت جحشؓ کا کسب یداور صدقہ کرنا۔

حضرت ابن مسعودؓ کی حرم محترم حضرت زینبؓ کا کسب یداور اپنے شوہراور اپنے زیر پرورش یتیموں پر انفاق۔

حضرت ام عطیہؓ کی اپنے شوہر کے ہم راہ چھ غزوات میں شرکت۔

حضرت ام حرامؓ کی مجاہدین سمندر کے ساتھ شہادت کی تمنا۔

حضرت ام ھانیؓ کا ایک حربی کو پناہ دینا اور اس پر اعتراض کرنے والے اپنے بھائی کی شکایت کرنا۔

ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کی حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بازپرس۔

حضرت اسماء بنت شکلؓ کا دین میں تفقہ حاصل کرنے لئے حیا کو رکاوٹ نہ بننے دینا۔

حضرت عمرؓ کی حرم محترم حضرت عاتکہ بنت زیدؓ کا نماز باجماعت ادا کرنے کا حق محفوظ رکھنا۔

حضرت ام کلثومؓ کا نوجوانی کی عمر میں اپنے شوہر سے مفارقت اور دین کی بقا کی خاطر ہجرت۔

عورت کا انتخاب شوہر کا حق۔

عورت کا شوہر سے مفارقت کا حق۔

حضرت سبیعہ بنت حارثؓ کی معرفت علم ویقین کے لئے جدوجہد۔

حضرت ام الدرداءؓ کی عبدالملک بن مروان پر نکیر۔

نوجوان خثعمی خاتون کی اپنے والد کے حج بدل کی فکر۔

حضرت ہندہ بنت عتبہؓ کا حضور اکرم ﷺ کو قبول اسلام کے بعد سلام کرنا۔

حضرت زینب بنت مہاجرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کے مابین گفت وشنید۔

حضرت ام یعقوبؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے درمیان گفتگو۔

مصنف نے ان موضوعات کے متعلق بے شمار احادیث کا ذخیرہ کرلیا لیکن تحقیق وتنقیح کے بعد صرف ان ہی احادیث کو اپنی کتاب میں جگہ دی ہیں جو صحیح اور بخاری ومسلم میں منقول ہیں اور اس انداز وترتیب سے احادیث نقل کی ہیں جس سے ایک حدیث دوسری کی تشریح کرتی چلی جاتی ہے اور اپنی طرف سے بغیر ضرورت کے کوئی تبصرہ یا تشریح نہیں کی ہے البتہ جہاں بھی حدیث کی تشریح وتوضیح یا ترجیح اور استنباط یا موجودہ حالات پر منطبق کرنے کی ضرورت محسوس کی تو بہت ہی دلنشیں اور علمی و تحقیقی انداز میں پیش کی ہے۔

کتاب کے آخری باب ''سماجی زندگی میں مردوں کے ساتھ عورتوں کی شرکت'' میں موصوف نے بہت ہی عمدہ اور مستند دلائل کے ساتھ گفتگو کی ہے ، یہ گفتگو ایک واقف اور رمز شناس، حالات سے باخبر نیز سماجی تبدیلیوں سے پوری واقفت رکھنے والے شخص کی گفتگو ہے، اس باب میں ان جدید سماجی اسباب کا تذکرہ کیا گیا ہے جنہوں نے موجودہ دور میں مرد وعورت کی شرکت کو لازمی قرار دے دیا ہے۔ میرا اور علماء کا مسلمہ اصول ہے کہ جس شخص کو نصوص از بر یاد ہو لیکن وہ موجودہ معاشرہ کے پیش آمدہ جدید سماجی اسباب و تقاضوں سے واقف نہ ہو اس کو خواتین کے مسائل پر کوئی فیصلہ کن رائے نہیں دینی چاہیے۔(۱۷)

دوسرا نکتہ جس پر مصنف نے زور قلم صرف کیا ہے، ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے جن کی وجہ سے نصوص کے معانی ومفاہیم میں تحریف ہوگئی ہے اور صحیح مفہوم ومعنی کے استنباط کی کوشش کرنا ہے، مثال کے طور پر و قرن فی بیوتکن اور وہ حدیث جس

میں عورتوں کو ناقص العقل والدین کہا گیا ہے ان دونوں پر مفصل و مدلل اوران کا صحیح مفہوم بیان کیا ہے۔

وقرن فی بیونکن کا صحیح مفہوم :

مذکورہ آیت اوراس سے ماقبل و مابعد کی آیات کی مخاطب امہات المؤمنین ہیں،اس کی تائید حضرت عمرؓ کے اس عمل سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ ازواج مطہرات کو حج کے لئے جانے سے مسلسل روکتے رہے، یہاں تک کہ اپنے آخری حج میں انہیں حج کی اجازت دی تھی۔یہ خاص حکم ازواج مطہرات کے لئے تھا اس کو عام سمجھنا اور دیگر خواتین پر اس کا انطباق کرنا غلط ہے،حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ کا قول وقرن فی بیوتکن ''حقیقت میں ازواج مطہرات کے ساتھ خاص ہے،(۱۸) علامہ ابن حجرؒ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ اوران کی رائے سے اتفاق کرنے والوں نے حدیث لکن احسن الجهاد و اجمله الحج(۱۹) ''کہ تم عورتوں کے لئے سب سے بہترین اور عمدہ جہاد حج ہے'' کے ذریعہ هذه ظهور الحصر(۲۰)''یہ پابندیاں ظاہر ہوئیں''اوراللہ کا قول وقرن فی بیوتکن عام حکم سے حج وغیرہ عبادات کے لئے اسفار کو مستثنی کرلیا تھا بعد میں حضرت عمرؓ نے بھی حضرت عائشہؓ سے اتفاق کرلیا تھا اوران کو اپنی خلافت کے آخری ایام میں اس کی اجازت دے دی تھی۔(۲۱)

اگر فرض کرلیا جائے کہ آیت سے مراد عام مسلم خواتین ہیں تو دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی ﷺ میں مومن خواتین سماجی زندگی میں شرکت کے لئے باہر نکلتی تھیں، بخاری و مسلم میں منقول بے شمار احادیث اس کا واضح ثبوت ہیں، آخر انہوں نے اس حکم کو کیوں نہیں سمجھا یا سمجھا تو عمل کیوں نہیں کیا ،لہذا اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ یہ خاص حکم امہات المؤنین سے متعلق ہے نہ کہ عام خواتین سے۔

حدیث ناقصات عقل و دین کی تشریح وتوضیح : یہ روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے مروی ہے

عن ابی سعید الخدری رضی الله عنه قال:خرج رسول الله ﷺ ،فی اضحیة و نظر الی المصلی ،فمر علی النساء فقال :یا معشر النساء.....ما رائیت من ناقصات عقل و دین اذهب للب الرجل الحازم من احداکن ..(۲۲)

اس حدیث کے صحیح فہم و معنی کے ادراک کے لئے تین پہلوؤں کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(۱) فرمان نبوی ﷺ کا عمومی مفہوم کیا ہے اس حدیث کی افہام و تفہیم کے لئے تین اجزاء ہیں ،اس حدیث کا سیاق وسباق کیا ہے؟ مخاطب کون ہیں اوراسلوب کیا ہے؟

صاحب کتاب نے ان اجزاء پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس حدیث کا سیاق وسباق یہ ہے کہ عید کے دن خواتین کو پند و وعظ کرتے ہوئے یہ بات آپ ﷺ نے فرمائی تھی ،غور کرنے کا مقام ہے کہ عید کے پرمسرت موقع پر معلم انسانیت ﷺ خواتین کی حقارت و ذلت اور ان کی شان کی فروتنی کا اسلوب اپنائیں گے؟ ہرگز اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی ہے۔

اس حدیث کی مخاطب خواتین مدینہ کی جماعت تھی ان میں اکثریت انصاری خواتین کی تھی ،ان خواتین کے متعلق حضرت عمرؓ نے سفر مایا تھا کہ جب ہم لوگ مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہاں کی عورتیں اپنے شوہروں پر غالب رہتی ہیں، ہماری بیویاں بھی ان کی یہ خصلت اپنانے لگیں۔(۲۳) اس تناظر میں اللہ کے رسول ﷺ کا قول کہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا جو عقل اور دین کے معاملے میں ناقص ہو،لیکن وہ ہوشیار مرد کی عقل کو گم کردے گی '' سے مکمل بات واضح ہوجاتی ہے، جہاں تک اسلوب اور انداز کا تعلق ہے اس سے بھی ہرگز کسی عمومی حکم یا عمومی قاعدہ کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ اظہار تعجب اور حیرت کا اسلوب ہے کہ کیسے کمزور صفت عورتیں دانشمند مردوں پر غلبہ حاصل کرلیتی ہیں اس متضاد کیفیت کے اندر کارفرما حکمت الٰہی پر حیرت وتعجب کا اظہار

ہے۔اللہ تعالی کی کیا شان ہے کہ وہ قوت کو کمزور اور کمزور کو طاقت ور بنا دیتا ہے، بہر حال یہ خواتین کی دلجوئی اور ان کی ہمدردی اور غمگساری کا انوکھا اسلوب تھا اور آپ ﷺ لطیف اشارہ کے ذریعہ ان کو یہ پیغام دینا چاہ رہے ہیں کہ وہ اپنی فطری کمزوریوں کے باوجود مردوں پر غالب آسکتی ہیں تو وہ یہ غلبہ نیکی اور بھلائی، خیر وفلاح اور خوف خدا کے ذریعہ ہی حاصل کریں۔ناقصات عقل ودین کے جملہ کا بھی یہی مفہوم ہے کیونکہ یہ جملہ ایک مرتبہ کے علاوہ کبھی بھی مستقل طور پر نہ مردوں کو کہا گیا ہے اور نہ عورتوں کے سامنے دوہرایا گیا ہے۔(۲۴)

اسی طرح مصنف (عبد الحلیم ابو شقہ) نے ان اہم اصول اور مسائل پر مدلل بحث کی ہے جن کے ذریعہ اکثر علماء نے عورت کے متعلق تشدد اور تنگی کا رویہ اپنایا ہے۔

آخر میں میں (یوسف قرضاوی) پورے اعتماد ووثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مصنف (عبد الحلیم) کی کتاب اپنے مستند نصوص، محکم دلائل، واضح مفہوم اور پختہ اقتباسات پر مبنی اسلامی کتب خانے میں ایک نادر اور بیش بہا اضافہ ہے، مخصوص ماحول اور مخصوص تعلیم و تربیت کے پروردہ حضرات کو اس کتاب سے جزوی طور پر اختلاف ہوسکتا ہے لیکن قرآن وسنت میں پیش کردہ عورت کے مقام ومرتبہ اور عہد رسالت میں اس کے کردار سے کوئی اختلاف نہیں کرسکتا یہی اس کتاب کا بنیادی مقصد ہے، اللہ تعالی اس کتاب کا نفع عام کرے اور اس کو مصنف کی نجات کا ذریعہ بنائے آمین۔

حواشی

(۱) صبحی الأعشی: ج،۱،ص،۹۶

(۲) رواہ احمد: ح،۲۶۱۹۵۔ابوداؤد: ح،۲۳۶،

(۳) قال العراقی فی تخریج الاحیاء: ص،۹۶.ج،۱

(۴) متفق علیہ: بخاری: ح،۹۰۰،مسلم: ح،۴۴۲

(۵) متفق علیہ: بخاری: ح،۳۰۴،:مسلم: ح،۸۰

(۶) مسند احمد: ح،۱۲۶۱۴

(۷) سنن بزار: ح،۵۲۶

(۸) المقاصد للسخاویؒ: ۵۸۵

(۹) فتاوی معاصرہ، یوسف قرضاوی: ج،۱،ص،۴۲۱۔۴۲۶

(۱۰) مستدرک للحاکم: ح،۳۹۶۔بیھقی: ۲۲۲۷

(۱۱) محاضرات الادباء، راغب اصفھانی: ج،۱،ص،۳۹۷

(۱۲) المنقذ من الضلال، الغزالی: ص،۱۳۹

(۱۳) بخاری: ح،۴۴۲۵

(۱۴) المقاصد للسخاویؒ: ص،۴۳۲

(۱۵) متفق علیہ: بخاری: ح،۵۹۳۷۔مسلم: ح،۲۱۲۴

(۱۶) مسلم: ح،۲۱۲۸،۔مسند احمد: ح،۹۶۸۰

(۱۷) اعلام الموقعین، ابن قیم: ج،۱،ص،۶۹

(۱۸) فتح الباری، ابن حجرؒ: ج،۷،ص،۱۰۸

(۱۹) بخاری: ح،۱۸۶۱

(۲۰) مسند احمد: ح،۲۱۹۱۰

(۲۱) فتح الباری: ج،۴،ص،۷۵

(۲۲)

(۲۳) بخاری: ح،۲۴۶۸،مسلم: ح،۱۴۷۹

(۲۴) تحریر المرائۃ فی عصر الرسالۃ: ج،۱،ص،۲۷۵،۲۷۶

☆☆☆

❑ نقد و نظر

دہلی سلطنت کی تمدنی تاریخ پر
سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصانیف۔ایک جائزہ

ذیشان سارہ
گیسٹ فیکلٹی، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو، حیدرآباد

دہلی سلطنت کی تاریخ پر مختلف مؤرخین نے متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں، اور دہلی سلطنت اور سلاطین کے کارناموں کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ انگریزی زبان میں بھی ہندوستان کی مسلم حکومتوں کے دور کی سیاسی، تہذیبی و تمدنی تاریخ لکھنے کا کام ہوا ہے اور کچھ کتابوں کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ان میں بی۔این پانڈے، پروفیسر ستیش چندر، ڈبلیو۔ ایچ مور یلینڈ اور کے ایس لال وغیرہ کی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ اس وقت اردو زبان میں دہلی سلطنت کی علمی و تمدنی تاریخ پر جو تحریری سرمایہ ملتا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے قلم کا مرہون منت ہے۔ جنھوں نے نہ صرف دہلی سلطنت بلکہ ہندوستان کی عظیم الشان تیموری سلطنت پر بھی خاص طور پر کام کیا ہے۔سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی پہچان ہی دراصل مورخ کی حیثیت سے ہے۔اس کے ساتھ ساتھ آپ بلند پایہ ادیب اور انشاء پرداز بھی تھے۔

آپ کی پیدائش بہار کے قصبہ دیسنہ میں 1911ء میں ہوئی۔ پیدائش سے پہلے والد صاحب کا اور بچپن میں ہی آپ کی والدہ محترمہ کا سایہ آپ کے سر سے اٹھ گیا۔جس کے بعد آپ کے اعزا و اقارب نے آپ کی تعلیم و تربیت کا ذمہ اٹھایا۔ابتدائی تعلیم دیسنہ، مظفر پور اور پٹنہ کے مدرسہ شمس الہدیٰ میں حاصل کی۔ پٹنہ یونیورسٹی سے بی۔اے اور ایم اے کی سند حاصل کرنے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ٹی کی سند حاصل کی۔1935ء میں آپ کی ملاقات سید سلیمان ندویؒ سے ہوئی اور اس طرح آپ دار المصنفین سے وابستہ ہوگئے۔(1)

دارالمصنفین کے قیام کے ساتھ علامہ شبلی نعمانیؒ نے جو خواب دیکھا تھا، اسے حقیقت کا جامہ پہنانے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بھی اہم کردار ادا کیا۔خود سید سلیمان ندویؒ نے آپ کی تصنیفی تربیت کی تھی اور خصوصا ہندوستان کی تاریخ لکھنے پر ہی مامور کیا تھا۔سلاطین دہلی و شاہان مغلیہ کے دور کے تمدنی حالات پر مبنی اپنی کتاب 'مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے' کی تمہید میں اسی بات کا حوالہ دیتے ہوئے وہ رقمطراز ہیں:

''استاذی المحترم حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے 1935ء میں مجھ کو دارالمصنفین طلب فرمایا، اس وقت ان کے سامنے ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی تاریخ کی تدوین و ترتیب کی ایک لمبی اسکیم تھی، دارالمصنفین کے اور رفقا دوسرے کاموں میں مشغول تھے، مولانا سید ابوظفر ندوی تاریخ سندھ لکھ رہے تھے، حضرت الاستاذ نے مجھ کو بھی تاریخ ہند کے کام میں لگایا، مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی تاریخ سندھ کی دو جلدیں لکھ کر احمد آباد واپس چلے گئے لیکن حضرت الاستاذ کی

وصیت تھی کہ میں تاریخ ہند کے سلسلہ کو ہر حال میں جاری رکھوں، اس لئے اس وقت سے اب تک تاریخ ہند ہی پر کتابیں اور مضامین لکھ کر ان کی وصیت اور اسکیم کو پورا کرنا اپنی زندگی کا مشن قرار دیا ہے۔''(2)

سید سلیمان ندویؒ کے انتقال کے بعد ناظم دارالمصنفین شاہ معین الدین ندوی کے ہمراہ ادارے کی انتظامی سرگرمیوں میں مشغول رہے۔اور شاہ صاحب کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ معارف کے مدیر کے طور پر اپنی علمی وتحقیقی خدمات انجام دیں۔52 برس تک آپ نہایت عرق ریزی اور خوش دلی سے اپنے محبوب استاذ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی دی ہوئی ذمہ داری نبھاتے رہے۔بالآخر 18 نومبر 1987ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔(3)

دہلی سلطنت پر سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصانیف:

دہلی سلطنت کی علمی وتمدنی تاریخ کو موضوع قلم بنانے کی وجہ شاہ معین الدین ندوی صاحب کتاب 'بزم مملوکیہ' کے مقدمہ میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہندوستان کے مسلمان خاندانوں میں تیموریوں کی عظمت اور ان کے کارناموں پر تو بہت لکھا گیا ہے، مگر ان سے پہلے کے سلاطین دہلی یعنی غلاموں، خلجیوں، تغلقوں اور لودیوں کے عہد کے علمی وتمدنی حالات کی جانب کم توجہ کی گئی ہے، اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کی کوئی اہمیت یا ان کے کارنامے نہیں ہیں، بلکہ ان کے حالات میں اس قسم کا تاریخی سرمایہ ہی کم ہے''۔(4)

دہلی سلطنت کی تاریخ پر صباح الدین عبدالرحمٰن کم وبیش 8 تصانیف ملتی ہیں، ان میں سے دستیاب کتب کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

1۔ بزم مملوکیہ:

یہ کتاب دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے 2016ء میں شائع ہوچکی ہے۔(*) جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے دہلی سلطنت کے بانیان یعنی پہلے حکمراں خاندان، خاندان غلاماں اور سلاطین مملوک کے دور حکومت کے تفصیلی علمی حالات پر مشتمل ہے۔اس میں ہر سلطان کے ذاتی احوال بیان کرنے کے بعد اس دور میں حکومت اور رعایا کے درمیان تعلقات، حکمرانوں کی علم دوستی، علماء پروری اور اس دور کے مختلف شعراء وادباء وغیرہ کے حالات، مستند واقعات اور مثالوں کے ذریعہ پیش کئے گئے ہیں۔

2۔ ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری: یہ کتاب دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ سے 2009ء میں شائع ہوئی۔ اپنی اس تصنیف میں صباح الدین عبدالرحمٰن نے ہندوستان میں اسلام کی آمد، یعنی محمد بن قاسم کی آمد اور قیام حکومت سے لے کر مختلف دہلی سلاطین اور دکن کی بہمنی حکومت پر مذہبی رواداری کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔اور محمد بن قاسم کی رواداری، غیر مسلموں اور مسلمانوں میں اتحاد وہم آہنگی، اور عرب مسلمانوں کی ہندوستان کے تئیں محبت کو دکھایا ہے، ساتھ ہی ہر دور کے ہندوؤں کے معاشرتی حالات کا بھی جائزہ لیا ہے۔اسی طرح علاء الدین خلجی اور فیروز شاہ تغلق کی رواداری کی مثالیں پیش کی ہیں، اور آخر میں غیر مسلم مؤرخوں کے دہلی سلاطین کے بارے میں تبصروں کو جگہ دی ہے' جو حقیقت پر مبنی مثبت واقعات کو بیان کرتے ہیں۔

* نوٹ: ''مضمون نگار نے تقریباً تمام ہی کتب کے آخری ایڈیشن کے سنہ اشاعت کا ذکر کیا ہے، جبکہ اس مضمون اور تحقیقی منہج کے مطابق اولین سنہ اشاعت کا ذکر کرنا چاہیے اور پھر یہ لکھنا چاہیے کہ میرے پیش نظر فلاں سنہ کا فلاں ایڈیشن ہے، طریق مذکور سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ کتب صباح الدین صاحب کی زندگی میں شائع ہی نہ ہوسکیں'' مدیر

3۔ مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے: یہ کتاب دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے 2009ء میں شائع ہوئی۔اس موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے، جس میں مصوری، موسیقی، آلات موسیقی، تقریبات، رسوم ورواج، تہوار، مختلف طرح کی لوازمات پکوان، ظروف اور طریقہ طعام، خورد ونوش کی اشیاء، خوشبوجات، پھول، سنگار، زیورات، جواہرات، مصنوعات، لباس، حرم شاہی کی بیگمات، محلات اور درباروں سے وابستہ تفصیلات تاریخی کتب کے حوالوں سے پیش کئے گئے ہیں۔

4۔ بزم صوفیہ:

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع ہوئی یہ کتاب 2014ء کا ایڈیشن ہے۔ بزم صوفیہ میں سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے عہد سلطنت کے 19 معروف صوفی شخصیات کی سوانح، تعلیمات اور اقوال کو قلم بند کیا ہے۔ان میں برصغیر ہندو پاک میں سب سے پہلے تشریف لانے والے صوفی بزرگ شیخ ابو الحسن علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، قاضی حمید الدین ناگوری، شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی وغیرہ شامل ہیں۔ مصنف نے ان اصحاب با صفا کی تفصیلات کو مستند ذرائع سے پیش کیا ہے۔

5۔ ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک:

دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ سے شائع ہوئی یہ کتاب 2012ء کا ایڈیشن ہے دہلی سلطنت پر آپ کی تمام تصنیفات میں اس کتاب کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس میں دراصل آپ نے ہندو مؤرخین کی کتابوں سے ان اقتباسات کو جگہ دی ہے جو سلاطین دہلی کی روشن تاریخ کو نمایاں کرتے ہیں۔تاکہ بعض مؤرخین نے اپنے مفاد خاصہ کے تحت مسلمان حکمرانوں کے خلاف جو غلط بیانی اور زہر افشانی کر رکھی تھی ان کی حقیقت طشت از بام ہوجائے، اور مسلم حکمرانوں کی حکمرانی کی اصل تصویر انصاف پسند مؤرخین کے قلم سے ہی واشگاف ہوجائے۔

6۔ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر: یہ دراصل آپ کا وہ مقالہ ہے جو آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ڈاکٹر عابد حسین کی صدارت میں پیش کیا تھا۔بعد میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے 1964ء میں اسے شائع کیا گیا۔اس کتاب میں مصنف نے سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے، علماء ومشائخ اور ادباء سے تعلقات اور ان کی نوعیت پر روشنی ڈالی ہے، اور ان علماء کی اصلاح معاشرہ کی کوششوں اور تبلیغ اور دعوت واشاعت دین کے حالات بھی بیان کئے ہیں۔مصنف نے اس کتاب میں سلاطین اور علماء کے مابین ہونے والی نا اتفاقیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے تاریخی رجحانات:

تاریخ نگاری صرف نقل نویسی کا نام نہیں ہے، بلکہ محنت اور جفاکشی سے تاریخی واقعات اور حادثات کی حقیقت کو تلاش کرنا اور انھیں دلائل کے ساتھ پیش کرنے کا نام ہے۔لیکن اس میں بھی کچھ مؤرخین نے حقیقت گوئی سے کام نہ لے کر تعصب، اشتعال انگیزی، جانبداری اور بے انصافی سے کام لیا ہے۔ وہیں متعدد مؤرخین ایسے بھی موجود ہیں جنھوں نے انصاف پسندی، حقیقت گوئی اور غیر جانبدارانہ رویہ کو اپنا شعار بنایا۔ انھیں میں سے ایک سید صباح الدین عبد الرحمٰن بھی ہیں، مندرجہ ذیل میں ان کے کچھ تاریخی رجحانات کا جائزہ مع مثال پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اعتدال پسندی:

سید صباح الدین عبدالرحمٰن اپنی کتاب ''ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری' کے دیباچہ

میں رقم طراز ہیں:

''کچھ ایسے مؤرخین بھی ہیں جو بعض مسلمان فرمانرواؤں کے تشدد کو ان کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات سے منسوب کر دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن ان کی اس قسم کی تحریریں تاریخی صداقت کے بجائے سیاسی مصالح اور مذہبی غیر رواداری پر مبنی ہوتی ہیں''(5)

اس اقتباس میں مصنف نے جہاں ان متعصب مؤرخین پر تنقید کی ہے تو وہیں کچھ مسلمان حکمرانوں کی سخت گیری کا اعتراف بھی کیا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ ہندوستان کے کثیر مذہبی سماج میں ہندو مسلمان دو فرقوں کو قریب لانے اور محبت و امن کو باہم استوار کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اسی کتاب میں ایک جگہ وہ مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کے موضوع پر لکھتے ہوئے کچھ اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

'' اس مقالہ میں یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان دونوں مذاہب (یعنی مسلمان اور ہندو) کے پیروؤں میں استیلاء اور اقتدار کی خاطر صرف خونریزی اور غارت گری ہوتی رہی، یا دونوں میں فراخ دلی، رواداری، بے تعصبی اور کشادہ دلی بھی رہی''۔(6)

آگے لکھتے ہیں:

''کسی ملک کے کسی دور کی صرف خونریزی اور ہولناکی کی داستانیں جمع کر دی جائیں تو اس کی تاریخ یقیناً قصائی کی دوکان ہو جائے گی، لیکن اسی عہد میں ایسے بہت کچھ مواد ملیں گے جن سے مہر و محبت کی داستانیں، دلجوئی اور دلنوازی کی حکایتیں قلم بند کی جائیں، تو اسی عہد کی تاریخ دل آزار ہونے کے بجائے دلنواز بن جائے''۔(7)

مؤرخ کا قلم تاریخی واقعات اور تاریخ نگاری سے کیسے کیسے رجحانات پیدا کر سکتا ہے، اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مؤرخ کا قلم بھی عجیب ہوتا ہے، یہ شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، کانٹا بھی ہے اور پھول بھی، زہر بھی ہے اور تریاق بھی، پیار و چمکار بھی ہے تو نفرت و عداوت کے تلوار کی جھنکار بھی، یہ کلیجہ کو چھید کر کے لاعلاج ناسور بھی پیدا کر سکتا ہے تو دلوں کو سرور بھی بخش سکتا ہے، اس مقالہ میں شبنم، پھول، پیار اور سرور کی کہانیاں سنانی ہیں''۔(8)

موصوف کے یہ الفاظ تاریخ نگاری میں آپ کے رجحان اعتدال کو ظاہر کرتے ہیں۔

صداقت اور استناد:

موصوف کی تاریخ نگاری کا یہ رجحان خاص بھی ہے اور مؤرخ ہونے کی حیثیت سے سب سے اہم بھی۔ آپ نے اپنی کتابوں میں حتی الامکان اس بات کا خیال رکھا کہ جو کچھ بھی واقعات پیش کئے جائیں وہ مستند ہوں، اگر چہ کچھ باتیں ایسی بھی ہوں گی جو ایک خاص مذہب، فرقہ یا گروہ کو پڑھتے میں ناگوار گذرے گی، لیکن اس وقت بھی قارئین کی ناگواری سے زیادہ آپ نے مستند تاریخی واقعات کو ہی نقل کرنا ضروری سمجھا۔

آپ کی تالیف ''بزم صوفیہ'' کے مقدمہ میں معروف عالم دین و دانشور مولانا عبد الماجد ریابادی موصوف کے اس رجحان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مؤلف سلمہ کی حیثیت اس کتاب میں محض ایک ناقل اور محتاط ناقل کی ہے، ناقد یا تبصرہ نگار کی نہیں، ملفوظات اور مکتوبات کے انبار عظیم میں انھیں جو کچھ اخذ و نقل کے قابل نظر آیا، حسن ترتیب و سلیقہ مندی کے ساتھ یک جا کر دیا، احتیاط اپنے نزدیک اس کی کر لی کہ جو امور خلاف شریعت یا بہت زیادہ مبالغہ آمیز نظر آئے، انہیں نظر انداز کر دیا، لیکن اتنی احتیاط

ناکافی رہی، کتاب میں خال خال نہیں کثرت سے مقامات ایسے آگئے ہیں، جن سے ایک سیدھے سادے متبع شریعت مسلمان کو وحشت ہونا لازمی ہے، قصور مؤلف کا نہیں، اصل ماخذوں کا ہے''۔(9)

اپنی کتاب ''ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' میں مصنف نے محمد بن تغلق کے علماء کے ساتھ رویہ پر تحقیق کی اور محمد بن تغلق کی علماء پر ظلم و زیادتی کا محققانہ جائزہ لیا۔ اپنی کتاب کے آغاز میں مہدی حسن کی سلطان محمد تغلق پر کتاب سے اس اقتباس کو نقل کیا کہ:

''سلطان محمد کیا تھا اور بنانے والوں نے اس کو کیا بنا دیا۔ وہ بیدار مغز، روشن خیال، درگذر کرنے والا اور متعدد خوبیوں کا مالک تھا۔ اس نے جاہل نما عالموں کی اصلاح کرنی چاہی تھی، مگر ناکام رہا، دشمنی پھیل گئی، اور مخالفت بڑھ گئی۔ اسی اثر کے تحت میں ایک تحریک ہوئی جس کی بنا پر سلطان کے ظلم اور اس کی خونریزیاں باقاعدہ لکھی گئیں''۔(10)

تاریخ نگاری میں غیر مسلم مؤرخین سے استفادہ:

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا ایک خاص امتیاز یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے تاریخ ہند اور احوال سلاطین تصنیف کرنے میں صرف اپنی تحقیق اور مسلمان مؤرخین سے استفادہ تک ہی اپنے آپ کو محدود نہیں کیا ہے۔ بلکہ وسیع النظری سے کام لیتے ہوئے اپنے دائرہ استفادہ کو وسیع کیا، اور جا بجا اپنی کتابوں میں غیر مسلم خصوصا ہندو مؤرخین کے اقتباسات، سلاطین پر ان کے تبصرہ اور ان کی آراء وغیرہ کو بھی جگہ دی۔ یہاں ان کی کتاب میں مذکور مختلف غیر مسلم مؤرخین کے مقالات کے عناوین اور ان کی کتابوں کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جارہا ہے، تاکہ سید صباح الدین کے دائرہ کار اور ان کے رجحان کا اندازہ ہو سکے:

☆'سلاطین دہلی کے زمانے میں ہندوؤں کے عام حالات'، یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر جناب ایم پنیکر صاحب کا ہے جو ان کی کتاب A Servey of Indian History سے لیا گیا ہے۔

☆''ہندوستان عربوں کی نظر میں''، یہ مقالہ جناب ایس سری نواس اچاری، پروفیسر تاریخ کا ہے جو ان کی کتاب History of India سے لیا گیا ہے۔

☆اگلا مقالہ پروفیسر سیتارام کوہلی کا ہے، جس کا عنوان ہے: ''ہندوستان مسلمانوں کی آمد کے موقع پر'' جو ان کی کتاب 'تاریخ ہند' سے لیا گیا ہے۔

☆اسی طرح ایک مقالہ ہے 'محمود غزنوی اور اس کے جانشین' جو سی وی وید پرکاش کی کتاب History of Medival Hindu India سے اخذ کیا گیا ہے۔

☆''البیرونی''، یہ اقتباس پروفیسر سینیٹی چٹرجی کے مقالے ''البیرونی اور سنسکرت'' سے لیا گیا ہے۔

☆''محمد غوری اور اس کے جانشین'' از پروفیسر اشیر بادی لال سریواستو' ان کی کتاب The Seltanat of Delhi سے لیا گیا ہے۔

ایسے ہی دیگر مقالوں میں این سی مہتا کا '{ سلاطین دہلی کے عہد میں معاشرتی حالات''، ایم سوامی آینگر کا مقالہ ''سلاطین دہلی کے عہد میں اقتصادی، تجارتی و صنعتی حالات''، ایشوری پرشاد، این سی مہتا صاحب کا ''ہندوستانی تہذیب اور اسلام'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام مقالوں اور اقتباسات میں مسلم حکمرانوں اور اس دور کے حالات پر مثبت، منفی، تعریفی اور تنقیدی ہر صورت سے جائزہ لیا گیا ہے، جس کو صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔(11)

یہ اس لئے بھی اہم ہے کہ مسلمان حکمرانوں کے بارے میں مسلمان مؤرخین سے زیادہ ایک غیر مسلم کی تحریر زیادہ مؤثر

رہے گی اور قارئین کو حقیقت کی طرف راغب ہونے پر مجبور بھی کرے گی۔

مصنف نہ صرف یہ کہ کھلے دل سے غیر مسلم مؤرخین کی مختلف آراء کو کشادہ دلی سے اپنی کتاب میں نقل کرتے ہیں بلکہ اشتعال پسند مسلمان مؤرخ کی اشتعال انگیزی کو بھی قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں، جو تاریخ نگاری کے اس تاریک رجحان پر بھی روشنی ڈالتی ہے جو تعصب یا عناد کا شکار ہو کر آنے والی نسلوں کے سامنے ان کے ماضی کی ایک بھیانک تصویر پیش کرتی ہے، اور انھیں اپنے ہم وطنوں کے تعلق سے شکوک و شبہات اور تحفظات میں مبتلا کر دیتی ہے۔

چنانچہ مصنف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی میں ان ہندوؤں کے خلاف بہت ہی سخت اور ناخوش گوار باتیں لکھی ہیں، جو سلاطین دہلی سے برسر پیکار تھے، اور ان کے خلاف باغیانہ روش اختیار کئے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ ضیاء الدین برنی کے کچھ ذاتی خیالات تھے جن کا وہ مختلف پیرایہ میں اظہار کرتے رہے''۔(12)

اس اقتباس پر تبصرہ میں سید صباح الدین نے بہت ہی اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ برنی کی ان تحریروں اور بعض جملوں اور بیانات کو پڑھ کر کوئی بھی غیر مسلم مشتعل ہوسکتا ہے۔ لیکن ضیاء الدین برنی کی ذاتی سوچ اور خیالات کو پڑھ کر اسے سارے مسلمانوں پر منطبق کرنا اور انھیں اسلامی تعلیمات سمجھ کر اسے دوسروں میں عام کرنا خلاف تحقیق و اخلاق بات ہوگی۔ آپ لکھتے ہیں:

''لیکن کسی مؤرخ یا کسی حکمراں کے قول و فعل کو اسلام کی تعلیم سمجھ کر اسلام سے نفرت کرنا اور پھیلانا نیک نفسی اور نیک نیتی کی دلیل نہیں ہوسکتی۔ محرور المزاج مؤرخوں، فقیہوں اور حکمرانوں نے وقتی مصلحتوں اور شاہی ضرورتوں کے مطابق اسلامی قوانین کی نامناسب تاویلیں کیں، تو وہ اسلام کی اصلی تعلیمات قرار نہیں دی جاسکتی ہیں''۔(13)

تاریخ نگاری میں ادبی اسلوب:

تاریخ کی ایسی کتابیں جو حقائق و دلائل پر مبنی ہوں، افسانوی لطف سے خالی ہوتی ہیں، لیکن سید صباح لدین کی کتاب 'مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے' کے دیباچہ میں شاہ معین الدین احمد ندوی اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''اس میں انھوں نے تمدنی نقش آرائیوں اور تہذیبی نفاستوں کا یہ مرقع سجایا ہے اور ان کے قلم سے تاریخ کے آئینہ میں تہذیبی جلووں کا ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ تاریخ میں افسانے کا لطف پیدا ہوگیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب تاریخی بھی ہے اور ادبی بھی''۔(14)

آپ نے اپنی کتاب میں دربار، محلات، لباس، پکوان، موسیقی وغیرہ سے متعلق تفصیلات کی ایسے انداز میں تصویر کشی کی ہے کہ سارا منظر قارئین کی نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

چنانچہ وہ بلبن کے دربار کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بلبن کا دربار آراستہ ہوتا تو ملوک و امراء، سینکڑوں نقیب، چاؤش، دیو پیکر جوان ننگی تلواریں لئے اس کے گرد و پیش کھڑے رہتے۔ دربار میں منقش فرش بچھا دیا جاتا، زربفت کے پردے لٹکائے جاتے، چاندی اور سونے کے برتن رکھے جاتے، جن میں میوے، شربت اور پان رکھ کر اہل مجلس کی تواضع کی جاتی، ضیاء الدین برنی کا بیان ہے کہ بلبن نے اپنی حکومت کے بیس سال کے دور میں شاہی وقار، شاہی آداب اور شاہی دبدبہ کو اتنا بلند کر دیا تھا کہ اس سے زیادہ بلند نہ ہوسکا، وہ کہا کرتا تھا کہ جو بادشاہ دربار کی آرائش، شاہانہ سواری کے

مراسم اور سلطنت کے آداب کا لحاظ نہیں کرتا، اس کا رعب و داب رعیت کے دلوں میں قائم نہیں رہتا، اور نہ دیکھنے والوں پر اس کی حشمت وجلالت کا کچھ اثر ہوتا ہے''۔(15)

عہد سلطنت اور عہد مغلیہ کی تمدنی تاریخ قلم بند کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' اب جب کہ قوموں کی تاریخیں لکھی جارہی ہیں، باشاہوں کی تاریخ لکھ کر پیش کرنا بظاہر اچھا نہیں معلوم ہوتا، لیکن ہماری زبان اردو میں اب تک بادشاہوں کی خاطر خواہ تاریخ ہی نہیں لکھی جاسکی ہے، اس لئے اس کمی کو پورا کرنا بھی ضروری ہے۔ پھر ان بادشاہوں ہی کی تاریخ' ہندوستان کی تاریخ سمجھی جاتی ہے، اوران ہی کی تمدنی زندگی نے اس ملک کی تمدنی زندگی کو مختلف طریقوں سے متاثر کیا ہے، اس لئے اس نقطہ نظر سے ان دونوں جلدوں کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہ ہوگا''۔(16)

خلاصہ:

اس مقالہ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے جن جن تاریخی رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے وہ صرف موصوف کی تاریخ نگاری کی معمولی جھلکیاں ہیں، جن کی تفصیلات سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ آپ نے اپنی کتابوں میں ماضی کی عکاسی اس انداز میں بھی کی ہے کہ اس دور کا سماج، اور سماجی احوال کی ایک تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے کے معاشرتی حالات، دونوں مذاہب ہندو اور مسلمانوں کی ایک دوسرے کے بارے میں رائے، پھر کس طرح دو گروہوں کی سوچ ایک دوسرے کے تعلق سے مثبت رجحان اپنانے لگی، پھر کیسے دو مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے فریق نہیں بلکہ رفیق بن گئے، ایک دوسرے کے تہواروں، تقریبات اور عیدوں میں شریک ہونا اور دھوم دھام سے منانا وغیرہ جیسی سماجی صورتحال کو تفصیل سے بیان کیا۔ بلاشبہ تاریخ نگاری میں آپ کی انصاف پسندی، مثبت سوچ، حقیقت شناسی، اعتدال اور غیر جانبداری ہندوستان کی تاریخ نگاری کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہے۔

مراجع:

1. دارالمصنفین کی تصنیفی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، سن اشاعت 2002ء
2. مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت 2009ء
3. دارالمصنفین کی تصنیفی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مطبوعہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، سن اشاعت 2002ء
4. بزم مملوکیہ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 2012ء
5. ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 2009ء
6. ایضا 7. ایضا 8. ایضا
9. بزم صوفیہ، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 2014ء
10. ہندوستان کے سلاطین، علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 1964ء
11. ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک ایک جھلک، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈیمی اعظم گڑھ، سن اشاعت:
12. ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، ،سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 2009ء 13. ایضا
14. مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ،سید صباح الدین عبد الرحمٰن، مطبوعہ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، سن اشاعت: 2009ء
15. ایضا 16. ایضا

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

بقلم : ڈاکٹر انور حسین خاں

نام کتاب: رجب طیب اردوغان
مصنف: ڈاکٹر راغب السرجانی
تعلیق وترجمہ: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
صفحات: ۳۲۸ قیمت: ۲۵۰
اشاعت: ۲۰۱۸ء
ناشر: ہدایت پبلشرز، شاہین باغ، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔۲۵

ہم سب بخوبی واقف ہیں کہ ہماری اردو زبان میں دنیا کی بیشتر اہم زبانوں کے ادب کی منتقلی کا عمل مسلسل جاری ہے، بلاشبہ ان قابل ذکر ترجموں کے سبب ہماری زبان کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے، اسی تناظر میں یہاں یہ امر ہم سب کے لیے مُوجبِ مسرت ہے، اور معلومات میں بیش بہا اضافے کا باعث بھی ہے کہ ایک کتاب عربی زبان میں صدر مملکت ترکی رجب طیب اردوغان کی انقلاب پرور حیات وشخصیت نیز ان کے روشن کارناموں پر شائع ہوئی تھی، جس کے مصنف مشہور مصری ادیب ومورخ ڈاکٹر راغب السرجانی ہیں۔ یہ عربی تصنیف جو ''قصۃ اردوجان'' کے عنوان سے ہے، اس کا اردو ترجمہ مع حواشی وتعلیق اردو کے بے باک صحافی، تجربہ کار مترجم اور صاحب فکرِ رسا ادیب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی نے بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ کیا ہے، جس کے لیے فاضل مترجم ہم سب کے شکریے اور مبارک باد کے مستحق ہیں، بلا مبالغہ یہ ترجمہ اتنا وقیع، مستند اور شاندار ہے، اور انداز بیان اتنا سلیس، دلکش اور شگفتہ ہے کہ موصوف مترجم کی یہ کاوش خود ان کی طبع زاد معلوم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر طارق ایوبی نے جہاں برجستہ اور رواں ترجمہ کر کے موجودہ دور کی اسلام پسند اور مسلمانوں کی پسندیدہ شخصیت رجب طیب اردوغان سے ہمیں متعارف اور روشناس کرایا ہے، وہیں موصوف کی یہ کاوش فن ترجمہ نگاری کا بہترین نمونہ ہے، اس کو اردو کے ذخیرہ میں بہترین اور بیش قیمت اضافہ تصور کیا جائے گا۔

یہاں یہ خیال رہے کہ ڈاکٹر راغب السرجانی کی مذکورہ بالا کتاب ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی تھی، ظاہر ہے کہ اس وقت سے لے کر اب تک ترکی سمیت پوری دنیا کا منظر نامہ کافی حد تک تبدیل ہو چکا ہے، ہمیں معلوم ہے کہ ترکی کے حالیہ الیکشن منعقدہ ۲۰۱۸ء میں رجب طیب اردوغان واضح اکثریت کے ساتھ اپنے ملک کے صدر منتخب ہوئے ہیں، علاوہ بریں اس حقیقت سے بھی کسی کو انکار ممکن نہیں کہ موجودہ اسلامی دنیا کی سیاست کے الٹ پھیر میں صدر موصوف کا قد اور مرتبہ پہلے سے کہیں زیادہ نمایاں اور ممتاز ہو چکا ہے، مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ فی الوقت عالم اسلام میں وہ تنِ تنہا امید کی کرن کے طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر طارق ایوبی نے پیش نظر عربی کتاب کا جہاں اردو میں ترجمہ بڑی عرق ریزی کے ساتھ کیا ہے، وہیں موصوف نے موجودہ عالمی سیاست بالخصوص ترکی سمیت عالم اسلام کے سیاسی حالات اور واقعات کا ۵۵ صفحات پر مشتمل نہایت منصفانہ تبصرہ وتجزیہ پیش کر کے گویا کہ عربی کتاب کے

مصنف ڈاکٹر راغب السرجانی کی پیش نظر کتاب کا تکملہ کر دیا ہے۔موصوف مترجم کی اس اضافی کاوش سے کتاب کی اہمیت و افادیت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

اس حقیقت سے کسی کو انکار ممکن نہیں ہے کہ اسلامی غیرت وحمیت سے معمور رجب طیب اردوغان کی شبیہ عالمی سطح پر نہایت اولوالعزم اور باحمیت قائد کے طور پر ہوتی ہے، جن کے افکار و کردار نیز اعلیٰ مقاصد ومفید اہداف کے تئیں صدر موصوف کی مسلسل جد وجہد معمولی نظر رکھنے والوں سے بھی پوشیدہ نہیں ہے، آج ہر شخص رجب طیب اردوغان کی عظیم شخصیت کا مداح اور ثنا خواں ہے۔ پیش نظر کتاب میں فاضل منصف ڈاکٹر راغب السرجانی نے اپنی ممدوح شخصیت کے بارے میں جو تاثر پیش کیا ہے، اور جو نتیجہ اخذ کیا ہے، اس پر تمام منصف مزاج لوگوں کا مکمل اتفاق ہے۔ دنیا کے موجودہ حالات میں بعض شیطانی اور ظالم طاقتوں کے مد مقابل رجب طیب اردوغان کی بے باکانہ سیاست، جرأت مندانہ فیصلے نیز بے خوف اقدام کے سبب عالمی سطح پر آپ نہایت قدر اور احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں، آپ نے اپنی دور اندیشی، بصیرت و فراست نیز کامیاب حکمت عملی سے اپنے وطن ترکی میں جہاں آپ کے اقتدار سے پہلے اسلام کا نام لینا گناہ تھا، بحمد للہ فکر اسلامی کو فروغ دیا، بلا شبہ آپ کے سینے میں اسلام کا حقیقی غم ہے، ایک طویل مدت سے ظلم وناانصافی اور بربریت کے خلاف نبرد آزما فلسطینیوں کے مسئلہ کے متعلق آپ کا یہ واضح نظریہ ہے کہ بیت المقدس مسلمانوں کے لیے سرخ لائن ہے، اگر یروشلم کھو دیا گیا تو ہم سے مدینہ کا تحفظ بھی نہ ہوگا، اور اگر مدینہ کا تحفظ نہ کیا جا سکا تو مکہ کا تحفظ نہ ہو سکے گا، جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ صدر موصوف نے عالمی سطح پر ہمیشہ دعوت کی پالیسی کو فروغ دیا، مختلف تہذیبوں کے درمیان باہمی مفاہمت پر یقین رکھا اور تعمیری مذاکرات کے لیے دروازے کھلے رکھے، صدر موصوف کا یہ نظریہ بالکل بجا نیز ان کے ایمان اور یقین کا حقیقی غماز ہے کہ کامیابی کا اصل سبب ایمان، اخلاق نبوی اور سنت نبوی کی سچی پیروی اور اقتدا ہے، اپنے عزیز عوام کے تئیں ان کا یہ موقف کسی مثالی اور فلاحی اسٹیٹ کے عین مطابق ہے کہ عوام کے زندہ رہنے سے ہی ریاستیں زندہ رہتی ہیں۔

آخر میں تفصیل میں نہ جا کر مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ رجب طیب اردوغان جیسے مجاہد، حق شناس اور حق گو ہیں، ویسا ہی انھیں ایک مخلص، دردمند اور دیانت دار مصنف بھی ملا، اور لطف کی بات یہ ہے کہ عین اسی طرح عربی متن سے اردو میں منتقل کرنے والا صاحب فکر وبصیرت مترجم ملا، جس کی خود کی شخصیت میں سوز دروں، خلوص، للّٰہیت، اور مجاہدانہ جذبہ عمل بدرجہ اتم موجود ہے۔

ہماری پُر زور سفارش ہے کہ عربی سے اردو میں منتقل ہوئی مذکورہ بالا کتاب رجب طیب اردوغان کا مطالعہ سبھی دردِ دل، پاس وفا اور جذبۂ ایمانی رکھنے والوں کے لیے از بس ضروری ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پیش نظر کتاب کے مطالعہ سے جہاں ہمارے خوابیدہ جذبات واحساسات بیدار رہوں گے، وہیں ہمارے کردار وعمل میں ظالم طاقتوں کے مد مقابل نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا ہوگا، یہی وقت کا شدید تقاضہ بھی ہے اور فاضل مصنف اور لائق مترجم کی منشا بھی۔

☆☆☆